بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کامران گل

کھلا خط

میری طرف سے تمام طلوع اسلام کی فکری تحریک چلانے والوں قرآنی نظام کو عام کرنے والوں کو بہت بہت سلام ورحمت۔

سب سے پہلے میں اپنا تعارف دیتا لچوں کہ میرا نام کامران ہے اور میں ایبٹ آباد کا رہنے والا ہوں اور سیکنڈ ایئر کا سٹوڈنٹ ہوں۔ میں طلوع اسلام کی فکری تحریک سے اچھی طرح واقف ہوں اور ماہنامہ طلوع اسلام کے مضمون اور پرویز صاحب کا لٹریچر پڑھتا رہتا ہوں۔ میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ قرآنی فکر عام کر رہے ہیں اور لوگوں کو صراط مستقیم دکھا رہے ہیں۔ یقیناً اس کام کے لئے جتنی بھی کوششیں کی جارہی ہیں قابل تعریف ہیں۔

طلوع اسلام' اس کی بزمیں سارے پاکستان میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ اسی طرح کام کرتی رہیں۔ قائم ودائم رہیں۔ اس کے علاوہ مغرب میں بھی بزمیں قائم ہیں ور وہاں اور زیادہ قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اسلام کے صحیح تصور سے مغرب کو متعارف کرائیں' قرآنی فکر عام کریں۔ کیونکہ وہ لوگ حقیقت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ جتنے بھی وہ لوگ اس دین کو سمجھیں گے اس کے بعد وہ لوگ خود اس دین کے قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں بھی طلوع اسلام اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ لیکن مغرب میں بھی دین کی زیادہ سے زیادہ درس وتدریس کی جائے۔ وہاں کے لوگ تمام نظام حکومت سے تنگ آچکے ہیں اور خدا کی راہنمائی کے متلاشی ہیں۔ مغرب کی چیخ و پکار اس کی گواہ ہے کہ وہ عالمگیر نظام چاہتے ہیں۔ سرمایہ دار اور متعصب لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ دین قائم ہوکر رہے گا۔ مغربی اقوام کو قرآن کا صحیح تصور وتعلیم دی جائے اور زیادہ سے زیادہ کوشس کی جائے۔ ہوسکتا ہے کہ اسلام کا سورج مغرب سے ہی طلوع ہوجائے۔ میری خواہش اور ہماری خواہش تو یہی ہے کہ دین کی پہل پاکستان سے ہو۔ لیکن یہ بات ضروری نہیں کہ دین کے قائم ہونے کی پہل پاکستان سے ہو۔

مغرب کے مفکرین اس کی تلاش میں سرگرم عمل ہیں۔ اگر ان مفکرین کے سامنے قرآن کا نظام کا تصور ہو اور اس قوم کے افراد جان جائیں تو قرآن کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر وحدت انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جاسکتا ہے۔ یہ لوگ تو حق کی تلاش میں ہیں اور غور وفکر کرتے ہیں۔ تو قرآن ان متلاشیانِ حق کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اگر تم عالمگیر انسانیت کی وحدت چاہتے ہوتو میری طرف آؤ۔

مذہب نے تو یہاں کے مسلمانوں کو ایسا پھنسایا ہے کہ اس جال سے نکلتا وہی ہے جو گہرے سوچ وفکر سے کام لیتا ہے اور یہاں پر لوگ ایسے بھی ہیں جو سمجھنا چاہتے ہی نہیں۔ ہمارے مذہبی پیشواؤں اور سرمایہ داروں نے مذہب کا جال اور بھی شدت اور وسعت سے پھیلا دیا ہے حتیٰ کہ اب یہ پھندے اور جال اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔

آخر میں میری آپ سے درخواست ہے کہ پرویز صاحب کے تمام لٹریچر خاص کر ''مفہوم القرآن'' کو انگریزی میں "Translate" کیا جائے اور مغربی بزموں کو پہنچایا جائے اور وہ آگے اس کی نشرواشاعت کریں اور وہاں کے بندے بندے تک یہ پیغام پہنچانے کی کوشش کریں۔ تاکہ جو لوگ اس کی کھوج میں نکلیں انہیں یہ مل سکے اور وہاں کے میڈیا' پرنٹ اور ٹی وی پر زیادہ سے زیادہ نشرواشاعت کریں۔ کیونکہ وہاں اس دین کے قائم ہونے کی واضح شہادتیں مل رہی ہیں۔ وہ لوگ آدمیت کے مقام تک تو پہنچ چکے ہیں۔ اب مقام مومن تک پہنچنا باقی ہے۔

میں یہ جانتا ہوں کہ یہ کام آسان نہیں لیکن ہمارا اس حقیقت کو جاننے کے ناطے اس فریضہ کا سرانجام دینا لازمی امر ہے۔

کامران گل

نوٹ: اس خط کا جواب آئندہ ماہنامہ طلوع اسلام میں شائع کیا جائے۔ عین نوازش ہوگی۔

میری اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور طلوع اسلام کی مجلس مشاورت میں بھی پیش کیا جائے اور طلوع اسلام کی تمام اندرونی اور بیرونی ملک بزموں کے سامنے بھی یہ تجویز رکھی جائے اور ان کی تجاویز بھی اس بارے میں معلوم کی جائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تھیاکریسی۔ بدترین نظامِ حکومت

(مسلمانوں کے سوا) دنیا میں کوئی اہل مذہب ایسے نہیں جن کے پاس، ان کی (مبینہ) آسمانی کتاب، اپنی اصل اور غیر محرف شکل میں موجود ہو۔ ان کتابوں میں یہ تحریف متعلقہ مذاہب کے مخالفین نے نہیں کی تھی۔ خود اس مذہب کے پیشواؤں (احبار و رہبان) نے ایسا کیا تھا۔ آسمانی کتاب ان کی من مانیوں کے راستے میں حائل ہوتی تھی، انہوں نے اس کانٹے کو نکال باہر کرنے کی یہ تدبیر سوچی کہ کتاب کے ان تمام حصوں کو بدل دیا جائے جو ان کے مفادات اور خواہشات کی راہ میں حائل ہوتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب (قرآن مجید) کو نازل کیا تو (منجملہ دیگر امور) اس کی وضاحت کر دی کہ

وتمت کلمت ربک صدقاً وعدلاً لا مبدل لکلمٰته..... (6/115)۔

تیرے رب نے جو کچھ نوع انسان سے کہنا تھا وہ اس کتاب میں، صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گیا۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔

اور تیسری خصوصیت یہ ہے کہ

انا نحن نزلنا الذکر و انالہ لحٰفظونo (15/9)

ہم نے اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

یعنی خدا کی یہ کتاب (۱) مکمل ہے اس لئے اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ (۲) غیر متبدل ہے اس لئے اس کے کسی حکم میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور (۳) محفوظ ہے۔ اس لئے اس میں کوئی تحریف بھی نہیں کر سکے گا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب، مذہبی پیشوائیت کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس کے گرد حصار ایسا باندھ دیا تھا کہ اس تک کسی غلط اندیش کی رسائی نہ ہو سکے۔ لیکن تدبیریں سوچنے والوں کا ذہن بڑا دراک ہوتا ہے۔ انہوں نے اس حصار کو توڑنے کی تدبیریں سوچ ہی لیں۔ ویسے تو یہ تدبیریں ہزار سال سے ہماری مذہبی کتابوں میں لکھی چلی آ رہی تھیں، لیکن آج کل ایک ضرورت کے تحت، ان کا چرچا عام ہونے لگا ہے۔

پاکستان میں ''اسلامی قوانین'' مرتب کرنے کا جب کبھی سوال سامنے آیا تو ہمارے علماء حضرات نے' رواروی میں کہہ دیا کہ کوئی قانون' جو کتاب وسنت کے خلاف ہوگا' غیر اسلامی قرار دیا جائے گا۔ کہنے کو تو ایسا کہہ دیا۔۔ ولے افتاد مشکل ہا۔۔ ملک میں سزائے رجم کا قانون یہ کہہ کر نافذ کرا دیا گیا تھا کہ یہ کتاب وسنت کے مطابق ہے وفاقی شرعی عدالت نے اس کا تجزیہ کرنے کے بعد فیصلہ دیا کہ قرآن میں ایسا کوئی حکم نہیں اس لئے یہ قانون' خلاف اسلام ہے۔ اس پر ان حضرات کو بڑی مشکل لاحق ہوئی کہ اب کیا کریں؟ لیکن اس کا حل انکے پاس موجود تھا ہفت روزہ اہل حدیث' لاہور کی اشاعت میں اس موضوع پر ایک طویل مقالہ شائع ہوا۔ اس میں لکھا گیا:

آج رجم کے بارے میں جو کچھ سمجھا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے تقریباً چودہ سو سال پہلے' امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے اس سے متنبہ فرما دیا تھا۔ بخاری' مسلم کی روایت کے مطابق انہوں نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا تھا۔ ''بے شک اللہ نے محمدؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور ان پر کتاب نازل فرمائی۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اس میں آیتِ رجم بھی تھی۔ ہم نے اسے پڑھا سمجھا۔ اور یاد کیا۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ حضرت عمرؓ کے ارشاد کے مطابق قرآن میں وہ آیت تھی لیکن جو قرآن امت کے پاس متوارث چلا آ رہا ہے' اس میں وہ آیت نہیں۔ تو وہ آیت کہاں چلی گئی[1] اور قرآن نامکمل ہو گیا؟ اس کا جواب سنئے۔ فرماتے ہیں:

مذکورہ بالا حوالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک سوال سامنے آتا ہے کہ دو انسانی زندگیوں کو ایک امر ممنوع کے مرتکب ہونے پر رجم کر دینا ایک بڑا ہی اہم مسئلہ ہے۔ لیکن قرآن مجید میں اب وہ..... آیت کیوں نہیں حالانکہ دوسرے مسائل کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا' تو ایسے اہم مسئلہ کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ اگر عمر فاروقؓ کی بات کو درست مان لیا جائے تو پھر آیت رجم کو منسوخ کیوں کیا گیا؟ ان سوالات کو حل کرنے سے پہلے قرآن کے ناسخ ومنسوخ کے اسلوب کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سو واضح ہو کہ ناسخ ومنسوخ کے بارے میں مفسرین اور ماہرین اصول تفسیر نے لکھا ہے کہ قرآن میں کچھ ایسی آیات بھی تھیں جن کی تلاوت منسوخ ہو گئی لیکن حکم جاری ہے۔ کچھ ایسی تھیں جن کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ کر دیئے گئے۔ دوسرے علماء کے علاوہ شاہ ولی اللہؒ نے بھی الفوز الکبیر میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ (اہلحدیث۔ ۲۴ اپریل ۸۱ء)۔

قرآن کریم میں تحریف کی وہ تدبیر جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے' ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ ہے۔ اقتباس بالا میں اس کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں لیکن درحقیقت اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) قرآن کریم میں کچھ آیات نازل ہوئیں۔ بعد میں انہیں قرآن سے نکال دیا گیا لیکن حکم ان کا باقی رکھا۔ پھر سن لیجئے کہ ان کے اس عقیدہ کی رو سے' قرآن میں آیات تو نہیں۔ لیکن ان کا حکم بدستور باقی ہے۔

(۲) ایسی آیات بھی نازل ہوئیں جنہیں بعد میں قرآن سے نکال دیا گیا اور ان کا حکم بھی باقی نہ رہا اور

(۳) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن میں موجود تو ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہے۔

یہ حلیہ بنا دیا گیا ہے اس کتاب عظیم کا جس کے متعلق خود خدا نے کہا تھا کہ وہ مکمل بھی ہے غیر متبدل بھی' اور ابدی طور پر محفوظ بھی۔ لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه..... (41/42) ''باطل نہ اس کے سامنے سے آ سکتا ہے' نہ پیچھے سے''۔

ناسخ و منسوخ کی ان تین شقوں کا تجزیہ کیجئے۔ شق اول یہ ہے کہ آیت تو قرآن میں موجود نہیں' لیکن اس کا حکم موجود ہے' جس پر عمل کرنا فریضۂ خداوندی ہے۔۔ آپ نے دنیا میں کوئی ایسی کتاب بھی دیکھی' سنی ہے جس میں الفاظ نہ ہوں۔ فقرے نہ ہوں۔ عبارت نہ ہو' لیکن حکم یہ ہو کہ تم نے اس کے مطابق عمل کرنا ہے جو اس میں نہیں ہے۔ جب ان حضرات سے پوچھا جائے کہ وہ کونسا حکم ہے جس کی تعمیل ہم پر فرض قرار دی گئی ہے' تو یہ عربی زبان کا ایک فقرہ آپ کے سامنے رکھ دیں گے کہ یہ ہے وہ حکم خداوندی! جب کہا جائے کہ یہ حکم خدا کی کتاب میں تو ہے نہیں' تو جواب ملے گا کہ بے شک یہ خدا کی کتاب میں نہیں لیکن ہمارے پاس ہے۔ حکم اسی آیت کا چلے گا جو ہمارے پاس ہے' نہ کہ اس قرآن کا جسے تم لئے بیٹھے ہو۔ ان کی یہ تدبیر انوکھی نہیں۔ قرآن کریم کے بیان کے مطابق سابقہ مذاہب کے پیشوا بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ سورۂ آل عمران میں ہے:

وان منهم لفريقاً يلون السنتهم بالكتٰب لتحسبوه من الكتٰب وما هو من الكتٰب ويقولون هو من عندالله وما هو من عند الله ويقولون على الله الكذب وهم يعلمون o (3/78)۔

اور ان میں سے ایک فریق ہے کہ زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں کتاب تا کہ تم جانو کہ وہ کتاب میں ہے اور وہ نہیں کتاب میں۔ اور کہتے ہیں وہ اللہ کا کہا ہے اور وہ نہیں اللہ کا کہا' اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں جان کر۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

اس پر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ حاشیہ میں لکھتے ہیں:

اہل کتاب کی تحریف کا حال بیان فرمایا۔ یعنی آسمانی کتاب میں کچھ چیزیں اپنی طرف سے گھٹا بڑھا کر ایسے انداز اور لہجے میں پڑھتے ہیں کہ ناواقف سننے والا دھوکے میں آ جائے' اور سمجھے کہ یہ بھی آسمانی کتاب کی عبارت ہے۔ یہی نہیں' بلکہ زبان سے دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ سب اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے' حالانکہ نہ وہ مضمون کتاب میں موجود ہے۔ اور نہ خدا کے پاس سے آیا ہے۔

یہ حضرات بھی عربی زبان کے چند الفاظ (اذزنی الشیخ والشیخة فارجموهما) پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہے وہ آیت جو قرآن میں تھی (هو من عندالله) اور ارشاد خداوندی ہے کہ (ما هو من عند الله) یہ خدا کی نازل کردہ آیت نہیں..... خدا کی نازل کردہ آیات سب کی سب اس کی کتاب میں محفوظ ہیں۔

یہ ہے رجم کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل!

(۲) ناسخ و منسوخ کی (ان کے نزدیک) دوسری قسم وہ آیات ہیں جو پہلے قرآن میں نازل ہوئیں لیکن انہیں بعد میں قرآن سے

نکال دیا گیا اور ان کا حکم بھی باقی نہ رہا۔

اس اعتبار سے ان آیات کی کوئی اہمیت نہ رہی۔ کیونکہ جو آیت نہ موجود ہے' نہ اس کا حکم باقی' اس کا ہم سے تعلق کیا ہے؟ لیکن اس عقیدہ کی رو سے قرآن کریم کے' خدائے علیم وخبیر کی کتاب ہونے کے خلاف جو اعتراض پڑتا ہے' اس سے تو اغماض نہیں برتا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ جب ایک آیت قرآن کریم میں درج کی جاتی تھی۔ اسے حفاظ' حفظ کرتے تھے۔ وسیع وعریض مملکت میں اسکی تلاوت ہوتی تھی' تو اس کے بعد جب اسے قرآن سے خارج کر دیا جاتا تھا تو اس کے لئے طریق کیا اختیار کیا جاتا تھا؟ آج کے دور میں تو ایسا کرنا پھر بھی آسان ہے۔ سرکاری گزٹ میں تنسیخ کا حکم جاری کر دینے سے' وہ حکم منسوخ قرار پا جاتا ہے' لیکن عہد نبویؐ میں تو نشر واشاعت کے یہ طریق رائج نہیں تھے۔ اس زمانے میں کیا کیا جاتا تھا؟ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ خدا اس کا انتظام خود کر دیتا تھا۔ وہ کیسے؟ سنئے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی مشہور کتاب' الاتقان (حصہ دوم) میں لکھا ہے:

طبرانی نے اپنی کتاب کبیر میں' ابن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''دو آدمیوں نے ایک سورت پڑھی جس کو خود رسول اللہ ﷺ نے انہیں پڑھایا تھا۔ وہ دونوں آدمی نماز میں اسی سورت کو پڑھا کرتے تھے۔ ایک رات کو وہ دونوں آدمی نماز پڑھنے کھڑے ہوئے تو ان کو اس سورت کا ایک حرف تک یاد نہ آیا' لہٰذا صبح ہی وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے شب کا ماجرا بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کا حال سن کر فرمایا۔ وہ سورت منسوخ شدہ قرآن میں تھی۔ لہٰذا تم اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ (اردو ترجمہ' جلد دوم' ص 76)۔

یہ طریق تو (بقول ان حضرات کے) ان آیات کے متعلق اختیار کیا گیا جو لوگوں کو حفظ یاد تھیں۔ جو آیات لکھی ہوئی تھیں' معلوم نہیں انہیں کس طرح محو کیا گیا؟

(۳) تیسری قسم ان آیات کی ہے جو قرآن میں موجود ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہے۔ وہ صرف تلاوت کے ثواب کے لئے قرآن میں رہنے دی گئی ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود کسی آیت کے متعلق نہیں بتایا کہ یہ منسوخ ہے اس لئے مذہبی پیشوائیت کی مرکب رانی کے لئے یہ میدان بڑا وسیع ہے۔ جس آیت کے متعلق جی چاہا' کہہ دیا کہ اس کا حکم منسوخ ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں قرآن کی کوئی آیت ہی دوسری آیت کو منسوخ کرتی ہو۔ حدیث بھی قرآنی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے۔

آپ کے دل میں یقیناً یہ سوال پیدا ہوگا کہ خدا کی کتاب کے سلسلہ میں اس قدر بے باکانہ تبدیلیوں کی اتھارٹی کس کو حاصل ہے؟ خدا نے تو ایسا کہیں نہیں کہا۔ اس سوال کا جواب اس اقتباس میں موجود ہے جسے پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

واضح ہو کہ ناسخ ومنسوخ کے بارے میں مفسرین وماہرین اصول تفسیر نے لکھا ہے کہ.....

یعنی یہ اتھارٹی مفسرین وماہرین اصول تفسیر کو حاصل ہے۔ موجودہ علماء' اپنے سے پہلے دور کے علماء کو بطور سند پیش کر دیتے ہیں۔

بعد میں آنے والے‘ موجودہ دور کے علماء کو سلف صالحین کے زمرے میں شامل کر کے‘ بطور سند پیش کر دیں گے۔ یوں یہ حضرات اپنے آپ کو اختیاراتِ خداوندی کا حامل قرار دے لیتے ہیں۔ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق: اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ .....(9/31)۔ ’’یہ لوگ اپنے علماء اور مشائخ کو خدا سے ورے ہی خدا بنا لیتے ہیں۔ جب ان ’’خداؤں‘‘ کا حکم‘ قانون مملکت کی حیثیت سے نافذ ہو‘ تو اسے (Theocracy) تھیا کریسی کہا جاتا ہے۔ یعنی خدا کی حکومت۔ خدا (The) اور حکومت (Cracy)۔ اور اس سے ہر صاحب ہوش خدا کی پناہ مانگتا ہے۔

آدمی کو خدا نہ دکھلائے۔ آدمی کا کبھی خدا ہونا

جب کوئی (خدا کا منکر) چنگیز یا ہلاکو‘ دوسرے انسانوں پر ظلم و ستم کرے‘ تو توقع کی جا سکتی ہے کہ شاید اس کے دل میں کبھی اس کے خلاف کھٹک پیدا ہو جائے‘ لیکن جب خدائی فوجدار‘ اس قسم کے مظالم‘ خدا کے نام پر کریں‘ تو ان کے دل میں اس کے خلاف کھٹک پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ اسے کارِ ثواب سمجھ کر سرانجام دیتے اور موجب خوشنودی خداوندی قرار دیتے ہیں۔ جس اذیت رسانی کو کارِ ثواب سمجھا جائے‘ اس کی شدت کی انتہا نہیں ہوتی۔ تھیا کریسی اسی لئے بدترین نظام حکومت ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آراء وافکار

جمیل احمد عدیل

جرم وسزا۔۔۔ایک اجمالی جائزہ

ہمارا نہیں خیال دنیا میں اس وقت اسلام کو چھوڑ کر کوئی دین موجود ہے۔ اسلام ہی واحد دین ہے باقی سب مذاہب ہیں۔ ہم جملہ مذاہب' ان کے پیروکاروں اور ان کے بانیان کا دل سے احترام کرتے ہیں کہ بہرنوع تمام مذاہب اخلاقی قدروں کے پرچارک ہیں۔لیکن دین اسلام کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ یہاں ایک مکمل سماجی' عسکری' سیاسی' عدالتی' انتظامی' معاشی سسٹم متعارف کروایا جاتا ہے جو فرد کی داخلی ضرورتوں سے لے کر اجتماعی ریاستی مسائل و معاملات تک محیط ہے۔ وضاحت کے لئے ایک سادہ ترین مثال پیش خدمت ہے۔ اگر کوئی ریفارمر آپ کو یہ سمجھائے کہ کار میں سوار ہوتے وقت پہلے دایاں پاؤں اندر رکھنا چاہئے اور یہ دعا پڑھنی چاہئے تو آپ سمجھ لیجئے کہ وہ صاحب اپنے تئیں ایک عمدہ اخلاقی اصول آپ کو ذہن نشین کروا رہے ہیں۔ اگر مذکورہ شخصیت اپنی تبلیغ کو یہیں تک محدود رکھتی ہے تو آپ یقین کر لیجئے کہ وہ ہستی معروف معنوں میں محض مبلغ اخلاق ہے۔ اگرچہ کسی فرد کی ذات میں بہتری کی نیت سے اتنا حصہ ڈالنا بھی معمولی نہیں ہے لیکن یہ جان لیجئے اچھی طرح' بہت ہی اچھی طرح کہ اسلام خود کو اسی حصار میں محصور نہیں کر لیتا۔ وہ یہ سوال بھی اٹھائے گا کہ یہ کار آئی کہاں سے ہے؟ کیا یہ جائز آمدن سے خریدی گئی ہے یا لوٹ مار اور ناجائز منافع خوری کا ''انعام'' ہے؟ اچھا اس سوال کو وہ نظری بحث تک ہی مقید نہیں رکھے گا بلکہ وحیٔ الٰہی کی روشنی میں حاصل کردہ قوتِ نافذہ سے باقاعدہ نظامِ عدل قائم کرے گا اور اس نظام عدل کی رو سے کسی فرد کے لئے یہ گنجائش نہیں چھوڑے گا کہ وہ ڈاکے میں چھینی ہوئی کار پر یوں دندناتا پھرے کہ کوئی اس سے باز پرس کرنے والا نہ ہو۔ مگر افسوس' صد افسوس ہمارے اپنے مبلغین یہیں تک محدود ہو کے رہ گئے ہیں کہ سواری میں سوار ہوتے وقت پہلے دایاں پاؤں اندر رکھو اور فلاں دعا پڑھا کرو۔ جب ان سے کہا جاتا ہے۔ صاحب! آپ کا فرمان سر آنکھوں پر' لیکن آپ بہشت کی بشارت کو اس قدر ارزاں کیوں کر رہے ہیں؟ آگے بھی بڑھئے اور اس نظام کے قیام میں مددگار بنئے

جس میں دولت کی تقسیم قرآنی قوانین کے نور میں طے ہو۔ موجودہ استحصالی طبقوں کی مذمت میں ایک لفظ تک کی ادائیگی کو آپ خلاف مصلحت سمجھتے ہیں۔ آپ اس کامیابی کو قرب خداوندی کی دلیل تو یقین کرتے ہیں کہ فرد نے لقمہ توڑنے سے قبل صحیح تلفظ' درست مخرج اور ٹھیک لہجے میں دعا پڑھنا سیکھ لیا ہے لیکن آپ نے کبھی یہ زحمت گوارا نہیں کی کہ معلوم کیا جائے وہ لقمہ آیا کہاں سے ہے؟ کیا وہ حلال ہے یا حرام؟ آپ مکان کی پیشانی پر کندہ عربی عبارت کی زیارت کو موجب ثواب اور اہل خانہ کے لئے باعث برکت قرار دیتے نہیں تھکتے لیکن آپ نے آج تک یہ تکلیف نہیں کی کہ پوچھا جائے اس عالیشان مکان کی بنیادوں میں کتنے مستحقین' کتنے ناداروں کا لہو جما ہوا ہے؟ یہ سوال کون اٹھائے گا؟ ہماری دانست میں یہ سوال اٹھانے والا وہ شخص ہوگا جو اسلام کی بطور دین کلیت کا قائل ہوگا جسے اس ایقان کا عرفان نصیب ہوگا کہ اس دین میں دنیا کے ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔ جس کا محکم ایمان یہ ہوگا کہ فرد کی نفسیاتی پیچیدگیوں کے علاج سے لے کر عظیم الشان ڈیم کی تعمیر تک جملہ اعمال سب فرائض دینیہ میں شامل ہیں۔

صاحبو! بس یہی فرق ہے مذہب اور دین میں۔ آگے بڑھئے مذہب نے یہ اخلاقی گر سکھا دیا مرد اور عورت کے بیچ ناجائز سمبندھ موجب فساد ہے۔ جبکہ دین نے اپنی عمارت یہاں سے اٹھائی کہ ایسے ناجائز تعلقات کو ان ان اقدامات کے تحت روکا جائے گا۔ پھر اس نے روک کر دکھا بھی دیا۔ اب پہاڑی وعظ کی تاثیر کس پر اثر کرے گی؟ اب کون ہے جو پہلے پتھر کی دعوت سن کر شرمسار ہوگا؟ اب ایک خاص درجے میں قوت کے ساتھ برائی کو روکنے کی ضرورت ہے۔ اچھا عجیب بات ہے جن معاشروں میں صرف طاقت کے ساتھ بروں کو کچلا گیا۔ برائی کا گراف نیچے نہیں آ سکا۔ مجرموں سے نفرت کرنے والے جرم کی روک تھام میں کامرانی حاصل نہیں کر سکے۔ یہ تاریخ کا ایسا سچ ہے جسے کوئی بھی جھٹلا نہیں سکا۔ دین اسلام کا امتیازی وصف یہی ہے کہ اس نے مجرم سے بے پناہ ہمدردی برتی ہے جبکہ جرم کی بیخ کنی پر ممکن حد تک توانائی صرف کر دی ہے۔ بڑا ہی عجیب پروگرام پیش کیا گیا ہے اس دین میں۔ یہاں ہر فعل اپنے نتائج کے اعتبار سے ابتداء اور انتہا کے نقاط میں اسیر ہے۔ یہاں صرف آغاز نہیں ہے کہ لوگو! اس برائی کے قریب نہ پھٹکو اور اس کے بعد ایک لامتناہی چپ ہو۔ یہاں یہ بھی نہیں کہ جہاں گناہگار دکھائی دے اسے معاً زمین میں زندہ گاڑ دو اور پتھروں کی بارش برسا دو۔ یہاں اصلاح کا عمل درجہ بہ درجہ آگے بڑھتا ہے اور پھر اپنی انتہائی صورت میں سزا کی افادیت سے مستفید ہوتا ہے اور کرتا ہے۔ سزا کے اطلاق سے قبل اتمام حجت' یہی دین اسلام کی تعلیمات کی تلخیص ہے۔ وہ ایسے مثالی معاشرے کا خواب پیش کرتا ہے کہ چور کے دھیان سے چوری کا تصور بخارات بن کے اڑ جائے۔ ظاہر ہے پھر ایسے شخص کو ''چور'' کے لقب سے ملقب کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اس سلسلے میں جن پُرحکمت اقدامات کا تانا بانا پیش کیا جاتا ہے اس کا مطلوب ومقصود یہ نہیں کہ جناب چور کو کسی طرح پھنسا کر اپنی تفتیشی ذہانت کی

داد وصول کی جائے۔ یعنی وہاں یہ نہیں کہ گھر میں کام کرنے والی خادمہ کے لئے پہلے جان بوجھ کر نقدی زیور کھلے رکھ دیئے جائیں' پھر اس کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر تھانیداری کا پروفیشنل ایوارڈ حاصل کیا جائے۔ وہاں تو یہ ہے کہ اس آبنوسی رنگت والی خادمہ کو ایسی ذہنی تربیت میں سے گزارا جائے کہ وہ اعتماد کے انمول رتن کی محافظ بن جائے۔ ذرا اور آگے بڑھئے کہ اس ملازمہ کی ضرورتیں معاشرہ اس احسن انداز میں پوری کر دے کہ اسے چوری کی ''ضرورت'' ہی پیش نہ آئے۔ ایک شخص کو چور نہ بننے دینا' ایک چور کو سزا دینے سے کہیں زیادہ افضل کام ہے۔

یہ ''آئیڈیلزم'' اپنی جگہ' لیکن جب ہر طرح سے اتمام حجت ہو جائے تو اس صورت میں' مجرم سے چشم پوشی بھی کم درجے کا جرم نہیں ہے۔ اب ہمارے ''روشن خیال'' اصحاب کا فرمان ہے کہ کسی بھی شکل میں کسی مجرم کو سخت سزا نہ دی جائے۔ اس تناظر میں ہمیں پوچھنا یہ ہے کہ اس مجرم نے جو قبیح فعل انجام دیا ہے کیا وہ قابل مواخذہ ہے یا نہیں؟ کیا اس کا عمل سوسائٹی کے لئے اذیت کا سبب بنا تھا یا نہیں؟ حیرت ہے جب کوئی فرد کسی بے قصور کو راہ چلتے موت کے گھاٹ اتار دے تو یہ اقدام منفی نہیں ہے لیکن جب اسی قاتل کو عدالت تختہ دار پہ کھینچ لیتی ہے تو اس عدالت کا یہ کرنا جبر و ظلم ہے۔ مانا کہ اسلام ایسے سماج کی تخلیق کا داعی ہے جس میں فرد کو ایسی تربیت' ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ کسی انسان کی گردن مارنے کا سوچ بھی نہ سکے۔ لیکن جب ادارے تمام مراحل طے کر لیں' فرد کو مثبت طرز احساس کا مالک بنانے کے لئے اپنی کل کوششیں بروئے کار لے آئیں' پھر بھی کوئی بگڑا ہوا اپنے فطری اختیار کا منفی استعمال کرتے ہوئے ایسا کام کر گزرتا ہے جو انسانیت کے لئے بے حد ایذا کا موجب بن گیا ہے تو ایسے موذی کو عبرت کا نشان بنا دینا ہر مہذب معاشرے میں بالکل جائز مانا گیا ہے۔

ہاں ایک صورت ہو سکتی ہے کہ جرم کو جرم نہ سمجھا جائے' پھر ہی اس جرم کی سزا پر واویلا کیا جا سکتا ہے' اسے جور و جبر سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اب آیئے اس طویل تمہید کے بعد اس موضوع کی جانب کہ جو طبقے زنا کی سزا کے مخالف ہیں وہ اسے جرم سمجھتے ہیں یا نہیں؟ ہم نے ان دنوں بڑے انہماک کے ساتھ فریقین کے مباحث سنے ہیں/ پڑھے ہیں۔ علماء کرام تو خیر شد و مد کے ساتھ اس حق میں ہیں ہی کہ زنا پر سخت تر سزائیں قیام امن کے لئے انتہائی ناگزیر ہیں۔ ان علماء کے مدمقابل جو روشن خیال صاحبان ہیں ان میں سے کسی ایک نے بھی اب تک یہ اعتراف نہیں کیا کہ زنا جرم نہیں ہے۔ ہمیں بس اتنا کہنا ہے یا تو میدان میں خم ٹھونک کر سامنے آئیں اور یہ کہیں ہاں جی Adultery کوئی خطا' کوئی گناہ' کوئی زیادتی' کوئی جرم ہے ہی نہیں' پھر کم از کم Logic کی رو سے اس پر ''وحشیانہ'' سزائیں دینا ناانصافی ''تسلیم'' کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سچی بات ہے' یہ پوتر نقطہ نظر تو آج تک نہ محترمہ عاصمہ جیلانی کی بابرکت زبان سے جاری ہوا ہے' نہ محترمہ حنا جیلانی نے کبھی ان خیالات عالیہ کا اظہار کیا ہے۔ نہ ان سب ماڈرن خواتین کی ''امام'' محترمہ کشور ناہید کی جانب سے یہ مقدس عندیہ سامنے آیا ہے۔ نہ حقوق

نسواں کی کسی اور علمبردار نے ایسی پاکیزہ سوچ ظاہر کی ہے اور ہم ان تمام واجب التکریم اعلیٰ تعلیم یافتہ روشن خیال خواتین کے متعلق حسن ظن رکھتے ہیں کہ یہ کبھی اس لغو اور لایعنی تصور کو قبول نہیں کریں گی کہ Rape جرم نہیں ہے۔ ظاہر ہے کوئی بالچوں' بہوؤں' بیٹیوں' بہنوں' ماؤں والی باشعور عورت یا صاحب فراست مرد کب ایسی آزاد خیالی کو اپنانے کی جسارت کرسکتا ہے؟

ہاں یہ درست ہے کہ ۹ فروری ۱۹۷۹ء کو جس مجہول شخص نے حدود آرڈی ننس کا جس انداز میں اجرا کیا۔ اس ضمن میں چند تحفظات کا اظہار ضرور کیا جاتا ہے اور ہماری دانست میں وہ تحفظات ایسے نہیں جنہیں درخور اعتنا ہی نہ سمجھا جائے۔ قرآن مجید ہی ہماری ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ چونکہ Rape ایسا گھناؤنا جرم ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حد مقرر کر دی ہے۔ اب کوئی فرد بشر اس میں ترمیم کا اختیار نہیں رکھتا اور ہم سمجھتے ہیں یہ خالقِ کائنات کا نوع انسان پر عظیم احسان ہے کہ اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راہنمائی فراہم کر دی ہے۔ اب جو معاشرہ اس راہنمائی سے فیض حاصل کرے گا' سلامتی اس کا مقدر لازماً بن کر رہے گی۔ قبل اس سے کہ Fornication کے حوالے سے قرآنی قوانین کا آموختہ یہاں دہرایا جائے ہم ممتاز مغربی محقق ڈاکٹر انون کو یہاں Quote کرنا چاہیں گے۔ اس کا کہنا ہے جو قوم جنسی تعلقات کو پابندیوں سے آزاد کر دیتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک زندہ رہ سکتی ہے۔ گویا عصمت کا تحفظ معمولی نوعیت کا فریضہ نہیں۔ معاشرے کی ایسی اساس ہے کہ ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے ذرا بھی کھسک گئی تو پھر آگے فساد ہی فساد ہے۔

یوں تو عصمت کی قدر و قیمت سے آگہی کے لئے قرآن مجید کی دو پوری سورتیں یعنی سورۃ النساء اور سورۃ النور متلاشیان حق کو گہرے مطالعے کی دعوت دیتی ہیں لیکن ان درج ذیل آیات میں تو گویا اصل الاصول کو جمع کر دیا گیا ہے تاکہ کسی کو اس باب میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے۔ یہ خدا کی متعین کردہ حد ہے اس میں کوئی کمی کرسکتا ہے نہ بیشی۔

سورۃ نور کی دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

''زانی عورت اور زانی مرد' دونوں کو سو سو کوڑوں کی سزا دو۔ یہ قانون کا معاملہ ہے۔ اس لئے اس میں کسی قسم کی نرمی نہ برتو' اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو (یعنی اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہو کہ یہ احکام خداوندی ہیں اور ان کے نتائج تمہارے سامنے آکر رہیں گے۔۔ خواہ اس دنیا میں یا اس کے بعد کی زندگی میں)۔ یہ سزا مومنین کے ایک گروہ کی موجودگی میں نافذ کرو (جو اس کے گواہ بن سکیں کہ سزا قاعدے کے مطابق دی گئی ہے)۔''

اب مذکورہ حکم ربانی سے دو تین نکات ہر قسم کے ابہام سے پاک سامنے آتے ہیں کہ بھلے اے لوگو! تمہیں یہ سزا بڑی ہی سخت محسوس ہو لیکن تم نے کسی کے ساتھ رورعایت نہیں کرنی۔ حتیٰ کہ مرد عورت میں بھی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ عمر کی قید نہیں ہے۔ ازدواجی' غیر ازدواجی حیثیت میں امتیاز

نہیں ہے۔ اسلامی حکومت کی طرف سے یہی سزا یکساں طور پر لاگو ہوگی۔ قرآن مجید میں جس عقوبت کا تعین ہو گیا ہے وہی اسے حد کی حدود میں شامل کرتا ہے۔ اب کسی میں مجال نہیں کہ وہ اللہ کی قائم کردہ حد میں تبدیلی کر سکے۔ نہ کوئی اسے کم کر سکتا ہے نہ بڑھا سکتا ہے۔ (لونڈیوں کے لئے بطور استثناء خود خدا نے کوڑوں کی تعداد نصف رکھی ہے)۔

البتہ زنا بالجبر کی صورت میں ظاہر ہے کہ سزا کا مستحق صرف جابر ہوگا' مجبور نہیں۔ ہاں زنا بالرضا کی شکل میں فریقین مساوی بنیادوں پر گرفت میں آئیں گے۔ اب رہا یہ سوال کہ جرم ثابت کیسے ہوگا؟ تو مذکورہ حکم کے ساتھ اس کا تعین اور طریق کار موجود نہیں ہے۔ یہ سٹیٹ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا قانون ترتیب دے کہ مجرم سزا سے بچ نہ سکے۔ قانون شہادت چونکہ بنیادی کلیہ تسلیم کیا گیا ہے' چنانچہ اصولی طور پر اسی سے یہاں بھی استفادہ کیا جائے گا۔ نیز میڈیکل کی ریسرچ نے اب اتنی Transparency کا بندوبست کر دیا ہے کہ DNA ٹسٹ کو جھٹلانا ناممکن ہے۔ تفصیل کا محل نہیں ورنہ ان ''ضوابط'' کا یہاں ضرور ذکر کیا جاتا جن کی رو سے کسی بھی ملزم/ملزمہ پر یہ الزام ثابت ہی نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً اسی لئے اس آرڈیننس کے نفاذ کے بعد آنجہانی سی ایم ایل اے کو CBS کی ٹی وی ٹیم کے سامنے یہ اعتراف کرنا پڑا تھا۔

''جہاں تک ان شہادات کا تعلق ہے جو اثبات جرم کے لئے پیش کی جائیں تو ان کے بارے میں بھی ایسی کڑی شرائط عائد کی گئی ہیں جن کی رو سے کسی ایسے شخص کا مجرم قرار پا جانا ناممکن ہوگا جس کے ارتکاب جرم کے بارے میں ذرا سا بھی شک وشبہ ہو''۔

لیجئے نہ تزکیۃ الشہود کے کڑے ترین معیار پر پورا اترنے والے چار گواہ ملیں جو خاص الخاص حالت غیر کے عینی شاہد ہوں نہ کسی پر حد جاری ہو۔ ہے کوئی Precedent؟ وہ قہار و جبار خدا سماج میں موجود برائی کا استیصال چاہتا ہے۔ کیا وہ شہادت کو اتنا پیچیدہ بنائے گا کہ مجرم صاف بچ کے نکل جائیں۔ اسی لئے اس نے جہاں سزا کا ذکر کیا ہے وہاں پکڑ کے طریق کار کو Unsaid چھوڑ دیا ہے کہ اپنی صوابدید کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ لاگو کرو کہ خطا کار اپنے انجام کو لازماً پہنچے۔

اب دیکھئے وہ حکیم خدا کس مرحلے میں گرفت کرتا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۵ میں فرمایا گیا ہے:

''اگر تمہاری عورتوں میں سے کسی سے ایسی بے حیائی کی حرکت سرزد ہو (جو زنا کی طرف لے جانے کا موجب ہوسکتی ہے) تو انکے خلاف' اپنے میں سے چار گواہ لاؤ۔ اگر وہ اس کی شہادت دیں (اور جرم ثابت ہو جائے) تو ان عورتوں کو باہر آنے جانے سے روک دو تا آنکہ انہیں موت آ جائے یا خدا کا قانون ان کے لئے ایسی صورت پیدا کر دے جس سے وہ اس قسم کی حرکات سے رک جائیں۔''

دوستو! درحقیقت یہ وہ بنیادی اقدام ہے جو معاملے کو آگے بڑھنے سے روکتا ہے نیز مقدمات زنا کے بد

نتائج سے مومنین کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر ابتدا میں قدرے نرم Punishment دے دی جائے تو ارتکاب جرم کی انتہائی حالت وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ واضح ہو کہ ہر مسئلے کا حل ''ناسخ و منسوخ'' ہی نہیں ہے۔ آیت مذکور میں فواحش کا تذکرہ ہے جو زنا پر منتج ہو سکتے ہیں اور ان فواحش پر چار Eye Witness لائے جا سکتے ہیں آسانی کے ساتھ۔ ظاہر ہے عمر قید کی یہ سزا کوئی فرد اپنے طور پر نہیں دے گا' قانون ہی ایسا کرنے کا مجاز ہوگا۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ یہاں عورتوں کا ذکر ہے' مردوں کا نہیں۔ حالانکہ فواحش کا صدور مردوں سے بھی ممکن ہے۔ ٹھیک ہے مردوں کو فواحش کی اجازت نہیں' انہیں بھی قانون معاف نہیں کرے گا۔ اصل Point یہ ہے کہ فواحش ایسے افعال ہیں جو فریق ثانی کے بغیر بھی صادر ہو سکتے ہیں جبکہ زنا میں فریقین کی موجودگی شرط ہے۔ نیز زانی مرد اور زانی عورت کی سزا چونکہ کوڑے طے ہو چکی ہے (بحوالہ سورۃ النور) لہٰذا ثابت ہوا کہ فواحش سے یہاں مراد مطلق زنا نہیں۔ بقول شخصے ''اس میں شبہ نہیں کہ زنا بھی فواحش میں شامل ہے لیکن ہر فحش کام زنا نہیں ہو سکتا''۔ اگر محولہ آیت میں فواحش سے مراد زنا ہی ہے تو پھر واقعی اس آیت کو منسوخ ماننا پڑے گا کیونکہ یہاں عمر قید کی سزا متعین ہوئی ہے اور اس میں نرمی کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ کورٹ Discretion کو بروئے کار لاتے ہوئے مجرم/ مجرمہ کے ساتھ معافی کا برتاؤ بھی کر سکتی ہے' سزا میں تخفیف بھی کر سکتی ہے غرض جرم کی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی بصیرت کے مطابق فیصلہ کر سکتی ہے۔ سوال وہی ہے پھر کوڑوں کی سزا کیا ہوئی؟ یہاں مقصود Obscenity کو روکنا ہے۔ جانے اس طرف ہمارے علماء کرام کیوں نہیں آتے؟ جتنی گندی فلمیں' غلیظ سی ڈیز کیبل کی وساطت سے اب ٹی وی پر چل رہی ہیں ایسے حیا سوز مناظر چشم تماشا نے پہلے کب دیکھے تھے۔ ''وہ بازار'' اب ترقی کر کے پوش علاقوں تک پہنچ گیا ہے۔ گانے/ مجرے ترغیب و کشش کے سب داؤ پیچ خوب چل رہے ہیں۔ ایسی بے شرم عورتوں اور ایسے بے غیرت مردوں کو قانون پکڑے' انہیں عمر قید دے۔ پھر دیکھئے کس طرح فواحش کا گراف نیچے آتا ہے۔

ویسے کتنی ''پٹھی مت'' ہے کہ زنا کے لئے چار گواہ مانگتے ہیں اور وہ بھی Act of Penetration کے۔ چونکہ ابھی تک زنا بالرضا والے بھی اتنے احمق نہیں ہوئے کہ وہ چار چار متقیوں کی موجودگی میں یہ شنیع فعل انجام دیں لہٰذا ہنوز ان میں سے کوئی نہیں پکڑا گیا۔ زنا بالجبر کا اہتمام کرنے والے بھی ظالم ضرور ہیں لیکن گھامڑ نہیں کہ کھلے بندوں اصحاب تقویٰ کی موجودگی میں یہ کام کرتے پھریں۔ سو وہ بھی شرعی سزا سے محفوظ ہیں۔۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے چار گواہوں کی شرط عائد کی ہے اور وہاں چونکہ چار گواہ بسہولت لائے جا سکتے ہیں اس لئے اڑ گئے ہیں کہ نہیں س آیت میں ''فاشتہ'' کا مطلب زنا ہے اور ابتدا میں اللہ کی طرف سے یہی سزا تھی جو بعد میں منسوخ ہو کر کوڑوں میں بدل گئی ہے۔ ویسے کوڑوں تک بھی کہاں قانع رہے ہیں' رجم تک پہنچے ہیں۔ جب رجم کی آیت قرآن میں نہ ملی تو اسے بکری کے شکم سے نکال لائے۔ یہ نہ سوچا کہ اللہ کی آخری کتاب جس کی پہچان

ہی یہ تھی کہ وہ محفوظ تھی ہر ردو بدل سے۔ اسے بھی مشکوک و مظنون بناڈالا۔ پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے۔

کس قدر حیرت کی بات ہے زنا کی سزا میں سختی کی طرف آئیں گے تو سوکوڑوں کو ناکافی قرار دے کر شادہ شدہ مرد و زن کو سنگسار کرنے سے کم پر راضی نہیں ہوں گے۔ فیاضی کا مظاہرہ کرنے پر آئیں گے تو ''متعہ'' کے جوازات پر براہین کا انبار لگا دیں گے' یہاں بھی قرار نہیں ملے گا تو لونڈیوں کو بلا نکاح رکھنے پر بھی اپنے ترکش سے دلائل کے سینکڑوں تیر نکال لیں گے۔ کتنی عجیب بات ہے' اتنی عجیب کہ ہماری تو سمجھ میں نہیں آتی۔ اور شاید آ بھی نہیں سکتی۔

اب آخر میں ''قذف'' کا ذکر ضروری ہے کیونکہ حدود آرڈیننس کے حوالے سے سب سے زیادہ یہی ضابطہ ہدف تنقید بنا ہے۔ قذف سے مراد تہمت تراشی ہے۔ یعنی جھوٹ کی سنگین نوعیت۔ ایک شخص نے ایک جرم کیا ہی نہیں۔ اس پر محض الزام عائد ہونے سے وہ مجرم نہیں بن جاتا تاوقتیکہ کوئی ایسی Evidence سامنے نہ آجائے کہ جسے بین ثبوت کہا جاسکے۔ یوں تو کسی بھی فرد پر تہمت لگانا قابل مذمت ہے لیکن مرد کی نسبت عورت تہمت کا بار اٹھانے کے معاملے میں کہیں کمزور واقع ہوئی ہے۔ قرآن مجید نے عورتوں کی تالیف کے لئے انہیں اس پس منظر میں مردوں پر ترجیح دی ہے کہ کسی بے چاری شریف زادی پر کردار کے اعتبار سے اگر تہمت عائد ہو جاتی ہے وہ تو کہیں کی نہیں رہتی۔ چنانچہ اس کا سدباب ضروری تھا۔ یقیناً قدیم عرب معاشرے میں ایسے لوگ موجود تھے جو اپنی نسلی عداوت کی آگ بجھانے کے لئے اپنے مخالف سے متعلق کسی عورت کو رسوا کرنے کے لئے اسے Loose Character مشہور کر دیتے تھے۔ آج بھی ایسے رذیلوں کا فقدان نہیں ہے۔ عورت اگر مذموم مقاصد کی تسکین کے لئے مرد کا آلہ کار بننے سے انکار کر دیتی ہے تو سفلہ صفت بڑی آسانی سے اسے سوسائٹی میں بدچلن کے عنوان سے معنون کر دیتے ہیں۔ کوئی تحقیق نہیں کرتا۔ چسکے لے لے کر سب اس بدقسمت کی بدنامی میں اپنا مقدور بھر حصہ ڈالنے سے دریغ نہیں کرتے۔ یوں اس بدنصیب کی نسلیں تک عذاب در عذاب کے عمل میں سے گزرتی رہتی ہیں۔ اس فتنے کی سرکوبی کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر بہتان تراشی کی مذمت کی ہے۔ سورۃ نور کی آیت نمبر ۴' ۶ ملاحظہ کریں:

> ''جب عصمت اس قدر متاع گراں بہا اور مستقل قدر ہے تو اس کی حفاظت کے لئے بڑی پختہ تدابیر کرنی چاہئیں۔ اس سلسلہ میں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور اپنے دعوے کے ثبوت میں چار گواہ نہ لائیں تو انہیں اَسی کوڑے لگاؤ اور اس کے بعد ایسے ساقط الاعتبار لوگوں کی جو دوسروں کے خلاف بے بنیاد الزامات لگائیں گواہی قبول نہ کرو اور انہیں ان حقوق سے بھی محروم کر دو جو اسلامی مملکت کے شریف انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ اس پر بھی اس سے باز نہ آئیں تو انہیں اس سے بھی زیادہ سخت سزا دو اس لئے کہ یہ لوگ صحیح راہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل

جاتے ہیں''۔

''ہاں! اگر یہ لوگ اس کے بعد اپنی غلط روش سے باز آ جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو پھر انہیں معاف کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ قانون خداوندی میں توبہ و اصلاح کے بعد عفو اور درگزر کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔ اس سے اتفاقی مجرم سزا سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے اور وہ سامانِ نشو ونما سے بھی محروم نہیں رہتا۔''

صاحبو! ان آیات کی روشنی میں حدود آرڈیننس کے حوالے سے دو ایک بڑی اہم الجھنیں پیش آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زنا کے ملزموں کے ساتھ اتنا ''نرم'' معاملہ کیا گیا ہے کہ اگر چار عینی شاہد نہ فراہم ہوں۔ مثلاً تین ہوں اور چوتھے نے Act of Penetration بچشم خود نہ دیکھا ہو بلکہ مرد عورت کو ایک چادر میں صرف ملفوف ہی دیکھا ہو تو ملزمان پر حد جاری نہیں ہو گی۔ اس تناظر میں اللہ کا قانون بے اثر دکھائی دیتا ہے۔ سوال وہی پیدا ہوتا ہے کہ پھر ایسے قانون کی ضرورت ہی کیا تھی؟ عقلِ سلیم یہی کہتی ہے کہ چار گواہ بھلے میسر نہ آ سکیں۔ ایک میڈیکل رپورٹ ہی کافی ہے لیکن دوسری طرف قذف کا مسئلہ ہے کہ عورت پر تہمت لگانے سے پیشتر چار گواہوں کا بندوبست کر لو ورنہ تہمت تراشی کے جرم میں اسی اسی کوڑے کھانے پڑیں گے۔ اب مسئلہ وہی ہے کہ وہ چار گواہ کس عمل کے شاہد ہوں گے؟ عین مین Act of Penetration کے یا محض قربت کے؟ قبل اس سے کہ ہم آگے بڑھیں سورۃ نور ہی کی ایک اور آیت کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ یہ تیرہویں آیت ہے۔

''اگلی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ الزام لگایا تھا ان پر واجب تھا کہ وہ اس الزام کے ثبوت میں چار گواہ پیش کریں۔ سو جب یہ لوگ گواہ نہیں لا سکے تو عدالتِ خداوندی کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں''۔

مفسرین نے آیت ۱۲ میں انک مبیـــــن (صریح تہمت) اور آیت ۱۳ میں چار گواہوں کے حوالے سے یہ جواز مہیا کیا ہے ''ان سے زنا کے سلسلے میں استنباط کیا جا سکتا ہے کہ اگر ان شہادات کی رو سے تہمت صحیح ثابت ہو جائے تو اس سے گویا جرم زنا ثابت ہو جائے گا۔ یوں جرم زنا کے ثبوت کے لئے بالواسطہ چار گواہوں کی شہادت کی تائید مل سکتی ہے''۔

ہم اس سلسلہ میں صرف یہ عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ زنا کے مقدمے میں چار گواہوں کے پیش کرنے پر پابندی نہیں ہے۔ اگر بالفرض کسی مجرم کے خلاف چار کیا چالیس گواہ پیش ہو جائیں تو اسے اس لئے بری نہیں کر دیا جائے گا کہ گواہ زیادہ کیوں تھے۔ ظاہر بات ہے کیس اس کے خلاف اور مضبوط ہو جائے گا (ہر چند ایسی مثالی سچوائیشن کی نظیر ملتی نہیں ہے) اسی طرح اگر گواہ چار کی تعداد میں فراہم نہیں ہو پاتے مگر دیگر ناقابل تردید شہادات سامنے آ جاتی ہیں تو بھی جرم یقیناً ثابت ہو جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے زنا کی سزا پر جو آیت بھیجی ہے اس میں بہرحال چار گواہوں کا براہ راست مطالبہ نہیں کیا گیا۔

اب رہا قذف کا مسئلہ۔ اس حد کا اختصاص بظاہر تو

پاکباز عورتوں تک ہی محدود دکھائی دیتا ہے کہ ان پر کوئی شریر الطبع بدکاری کا الزام عائد کر دے تو خدانکردہ وہ بدکار ثابت نہیں ہو جاتیں۔ سو، سوچ سمجھ کر اتہام لگانا چاہئے یونہی بے پر کی اڑانے سے۔۔۔ معاشرے میں فتنوں کو ہوا ملتی ہے، اعتبارات گم ہوتے ہیں، افواہیں جنم لیتی ہیں، بھروسے کی فضائیں آلودہ ہو جاتی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے امن وسلامتی برباد ہو جاتے ہیں۔ سوسائٹی جہنم نظیر بن جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان شریروں کی حوصلہ شکنی کی ہے اور ان کی بھی جو بلا سوچے سمجھے دوسروں کے بہکاوے میں آ کر شریف خواتین کو رسوائی کا اشتہار بنا ڈالتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو یہ ڈر ہوگا کہ ہم تہمت کو درست ثابت نہ کر سکے تو قذف کی حد کی زد میں آ جائیں گے۔ یوں یقیناً وہ جلد بازی سے کام نہیں لیں گے۔ خواہ مخواہ ایذ رسانی کا موجب نہیں بنیں گے۔

بلاشبہ اس سوال کا Weight بھی معمولی نہیں ہے کہ اگر کسی عورت کی بدچلنی پر ایک ہی گواہ ہو یا تعداد میں وہ گواہ چار سے کم ہوں تو کیا کیا جائے؟ اس سلسلہ میں ایک بار پھر آیت مذکور کے نفس مضمون پر تدبر کی ضرورت ہے۔

''اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ لائیں تو انہیں اَسی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور وہی نافرمان ہیں۔''

یہاں محصنٰت (شریف عورتوں) کا ذکر ہے یعنی وہ خانہ دار خواتین جن کی عام تعریف شرافت ہے جن کا ماضی آلودہ نہیں ہے۔ اگر ان گھریلو بیبیوں پر اٹھ کر ہر ایرا غیرا اتہامات کی سنگ باری شروع کر دے گا تو معاشرہ تہ و بالا ہو جائے گا۔ چنانچہ یہاں ان لوگوں کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے جو اپنے ذوقِ فساد کو نشو ونما دینے کے شوق میں عزت دار مستورات کو نشانہ بنا کر انہیں آناً فاناً بربادی کے گڑھے میں پھینک دیتے ہیں۔ سو قرآن نے ان نازک آبگینوں کی حفاظت کے لئے غایت درجہ حزم و احتیاط کی تلقین کی ہے اصل مقصد منفی تشہیر سے روکنا ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی اکیلا دوکیلا کسی خاتون کے متعلق بالفرض خاص قسم کی معلومات رکھتا بھی ہے تو وہ فی الفور انکا جھنڈا بنا کر گلی کوچوں میں نہ لہرانے لگ جائے۔ اسے اپنی زبان بند رکھنی چاہئے کہ اس میں معاشرے کی وسیع تر بہتری مضمر ہے۔ ہاں اگر صوت پایہ ثبوت اور رتبہ حق الیقین والی ہے تو چار مضبوط گواہ اپنی ناقابل تردید شہادتوں سے لیس ہو کر عدالت میں آئیں، واضح رہے مدعی ان چار شاہدوں میں شامل نہیں۔ اب منصف تمام احوال وکوائف کے تناظر میں جائزہ لے گا۔ اگر بالفرض گواہان جرح وتعدیل کے بعد کاذب ثابت ہو گئے تو اس پردہ دار بی بی کی عصمت Restore کرنے کے لئے عدالت اتنا تو ضرور کرے گی کہ قاذفوں کو اَسی اَسی کوڑے سرعام مارے گی تاکہ آئندہ کسی کو ایسی جرأت نہ ہو۔

اس مرحلے میں ہم ایک بار پھر اسی نکتے کی جانب لوٹنا چاہیں گے جس نے بڑے بڑوں کو Confuse کر دیا ہے۔ اگر جرم زنا پر چار عینی شاہد (Act of Penetration کے گواہ) میسر نہ ہوں تو حد جاری نہیں ہو سکے گی۔ زمینی حقائق شہادت دیتے ہیں کہ نہ یہ شرط کبھی پوری ہوئی اور شاید ہو بھی نہیں سکتی چنانچہ کسی کو Exclusively

اسی بنیاد پر سزا نہیں ہوئی۔ پھر ایسے قانون کی تشکیل سے کیا حاصل؟ جواب اس کا یہی ہے کہ جہاں اس سزا کا ذکر ہے وہاں چار گواہوں کی شرط مذکور نہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت کارفرما ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ سوسائٹی پرامن رہے اور قیام امن کے لئے ضروری ہے کہ عادی مجرموں کے ساتھ نرم برتاؤ نہ کیا جائے۔ عدالت حالات و واقعات کے مطابق ایسے مجرموں کے ساتھ لازماً سخت معاملہ کرے۔ اس لئے گواہوں/گواہیوں کو اس نے عدالت پر چھوڑ دیا ہے۔

آیئے اب آپ کے سامنے اس آیت کے حوالے سے ایک اور معقول نکتہ ایک مفسر کے شکریے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

''یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں صرف زانی یا زانیہ کا لفظ نہیں رکھا۔ بلکہ الزانیۃ و الزانی کے الفاظ رکھے ہیں یعنی الف لام کی زیادتی کی گئی ہے اور الف لام کی زیادتی ہمیشہ معنوں میں تخصیص پیدا کر دیا کرتی ہے۔ پس اس جگہ الزانیۃ و الزانی سے صرف ایسا شخص مراد ہوسکتا ہے جو یا تو زنا کا عادی ہو یا علی الاعلان ایسا فعل کرتا ہو اور اتنا نڈر اور بے باک ہوگیا ہو کہ وہ اس بات کی ذرا بھی پروا نہ کرتا ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے یا نہیں''۔ 1

اس نقطہ نظر سے کسی کے لئے بھلے مکمل اتفاق کی گنجائش پیدا نہ ہو لیکن اس پہلو سے کم از کم لازماً متفق ہونا پڑے گا کہ مشیت ایزدی کی نظر میں عقوبت کے اصلی مستحق وہی قرار پاتے ہیں جو اپنے جرم میں بے باک ہو چکے ہوں۔ دیکھئے کبھی کبھی بادی النظر میں کسی قانون کی نظری جہتیں عملی تنفیذ سے قدرے مختلف ہو جایا کرتی ہیں۔ درحقیقت یہ جج کی بصیرت کا امتحان ہے کہ وہ کس طرح ملزم کی شخصیت کا بھرپور جائزہ لیتا ہے۔ عادی مجرموں سے اسے کبھی صرفِ نظر نہیں کرنا چاہئے۔ ملزم کی ہسٹری شیٹ بڑی ہی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہے۔ جھوٹے' خائن' مکار' بدزبان اور دیگر جرائم میں ملوث افراد کے بارے میں تازہ مقدمہ اپنا فیصلہ خود سنا دیتا ہے۔ اگر جج نے ملزم کا ریکارڈ مدنظر نہیں رکھا تو اس نے گویا انصاف کا خون کر دیا۔ واقعتاً داخلی شہادت کی توانائی بے حد اہم ہوتی ہے اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

مختصر یہ کہ سورۃ نور کی آیت ۲ کے نور میں یہی مترشح ہوتا ہے کہ الزانی اور الزانیہ کو کبھی معاف نہیں کرنا چاہئے۔ ان کا برا ماضی پکار پکار کر کہہ رہا ہوتا ہے کہ یہ اس قدر نڈر' سرکش اور بیباک ہو چکے ہیں کہ اب کسی رورعایت کے حق دار نہیں رہے۔ اب یہ عدالت کی صوابدید پر ہے کہ وہ کن شہادتوں پر اعتماد کرتی ہے۔ ایک اور توضیح کہ عدالت گواہوں اور گواہیوں کو At Par رکھ سکتی ہے۔ مثلاً وہ فنگر پرنٹس کی رپورٹ کو ایک مکمل گواہ کی حیثیت دے سکتی ہے۔ مثلاً اس کی نگاہ میں دوسرا گواہ DNA کی رپورٹ قرار پا سکتی ہے۔ مثلاً وہ تیسرے گواہ کا درجہ قرائن اور احوال و کوائف کی گواہی (Circumstantial Evidence) کو دینے کی مکمل مجاز ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسفؑ کے کیس میں دامنِ یوسفؑ کی بریدگی کو Acknowledge کیا گیا

ہے۔ ایسی ہی Admissibility ہو تو اسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے اور اس ''گواہی'' کو ''گواہ'' کے مساوی رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ ایک اور مسئلہ بھی ہے کہ ہم روایتی ''مسلمان مرد'' گواہ پر اڑے ہوئے ہیں۔ اس عاجز کی نظر میں تو مسلمان کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ قوانین خداوندی کا سچا پیروکار ہو۔ اچھی بات ہے کہ اگر وہ متداول معنوں میں بھی مسلمان ہو۔ لیکن یہ بھی کیا ہوا کہ ایک طرف مدرٹریسا ہو جسے ہم آنکھیں بند کر کے ''غیر مسلم'' اور ''عورت'' ہونے جیسے ''ناقابل معافی جرائم'' کی بنا پر یک قلم مسترد کر دیں اور دوسری جانب سعادت بلوچ یا غیاثا کھڑے ہوں' انہیں ہم ''مسلمان'' اور ''مرد'' ہونے کے آسمانی اوصاف کی بنا پر قبول کر لیں۔ جج کے مدنظر بس اس مقدمے کا نتارا ہونا چاہئے' روایتی مسلم' نان مسلم' مرد' عورت کے چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اب اگر چشم دید گواہ اتفاق سے عورت ہے تو ٹھیک ہے اس پر غیر جانبداری سے جرح کر کے اس کی گواہی کو بھی Consider کیا جا سکتا ہے۔ مرد گواہ کے مطالبے پر بیٹھ رہنا کہاں کی دانشمندی ہے؟'' تا تر یاق از عراق آوردہ شود' مار گزیدہ مردہ شود''۔ کتنی دلچسپ بات ہے کہ ہم لیبارٹری میں جا کر اپنا بلڈ ٹسٹ کرواتے ہیں۔ جن آلات کی مدد سے ہمارے خون کے نمونوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے وہ سب ''غیر مسلموں'' کی عطا ہیں۔ اس ضمن میں جو فارمولے مرتب کئے گئے ہیں وہ بھی کافروں کی دین ہیں۔ ان کی روشنی میں ہمارے سامنے جو رپورٹ آتی ہے ہم اس پر تو پورا بھروسہ کر لیتے ہیں وہاں کبھی تقاضا نہیں کرتے کہ اس مائیکروسکوپ کا موجد تزکیۃ الشہود کے کڑے معیار پر پورا اترنا چاہئے کبھی یہ سوال نہیں اٹھاتے کہ یہ سلائیڈیں جس نے 'ایجاد' کی تھیں کیا وہ متقی تھا یا نہیں؟ لیکن جب زنا بالجبر کا مجرم عدالت میں کھڑا ہو تو ہم کہتے ہیں اس کے فعل شنیع کے شاہد اصحاب تقویٰ مرد مسلمان ہوں۔ گویا یہ طے ہے کہ غیر مسلموں میں کوئی دیانتدار ہو ہی نہیں سکتا اور یہ عالمی صداقت ہے کہ مسلمانوں میں کوئی لچر لغو بے ہودہ ممکن ہی نہیں۔ بہت خوب!

آخر میں قذف کی سزا کا دوبارہ تذکرہ کریں گے تاکہ کسی نوع کا اشتباہ ذہن میں نہ رہے۔ ہماری نگاہ میں سورۃ نور کی ان آیات کریمہ کی لطافت اور باریکی بجائے خود منور شہادت ہیں کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ بدطینتوں کی بدطینتی' سرکشی اور بدچلنی کے ریکارڈ کی وجہ سے ان کے لئے سزا کو یقینی بنا دیا گیا ہے' چار گواہوں کی شرط کو محذوف کر کے۔ آگے چل کر محصنٰت (باوقار نیک خواتین) کی عصمتوں کی سلامتی اور حفاظت کے لئے چار گواہوں کی Condition لگا دی ہے تاکہ گھٹیا ذہنیت رکھنے والوں کو Discourage کیا جا سکے۔ مطلب یہ کہ عادی مجرم کسی صورت بچ نہ سکیں اور باحیا بیبیوں پر ناحق تہمت عائد ہو نہ سکے۔ سبحان اللہ اور اس قرآن' اس کلام کی حکمت پر کس برہان کی ضرورت ہے؟ بے شک خدا حکیم ہے' اور لاریب وہی حکیم ہے۔

اچھا ایک جہت ابھی تشنہ ہے۔ حدود آرڈیننس کے حوالے سے یہ سوال بڑی شدومد کے ساتھ اٹھایا جاتا ہے

کہ اگر کسی عورت کے ساتھ کوئی اوباش مرد زیادتی کر گزرتا ہے۔ وہ شریف زادی لٹی پٹی عدالت میں جاتی ہے' انصاف مانگتی ہے مگر جج اس سے کہتا ہے۔ ''بی بی! چار گواہ لاؤ''۔ اب وہ کہتی ہے ''مائی باپ! میں گواہ کہاں سے لاؤں کہ اس موقع پر بجز اس جابر کی اور کوئی موجود نہیں تھا''۔ اول تو جج اس کی فریاد سنے گا ہی نہیں۔ اگر اس نے کسی طرح اپنا احتجاج ریکارڈ کروا ہی دیا۔ اب حضرت جابر میدان میں کود پڑیں گے۔ جناب! یہ عورت میرے اوپر الزام عائد کر رہی ہے۔ اسے کہیں اگر یہ سچی ہے تو چار عدد گواہ لائے۔ ظاہر ہے وہ گواہ نہیں لا سکے گی۔ یوں وہ قاذفہ قرار پا جائے گی۔ چنانچہ عدالت اسے سرعام اَسی کوڑے مارنے کی مجاز ہو گی۔ یعنی کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنے۔ ایک بیچاری کی آبرو ریزی ہوئی۔ رہی سہی کسر اَسی کوڑوں کی صورت میں پوری کر دی جائے گی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟

ہم نے کئی مذہبی احباب سے استفسار کیا محترم! بتائیے اس مسئلے کا حل؟ اک لمبی چپ ہی ہمارے سامنے آئی جو یقیناً ہمیں معقول محسوس ہوئی بہ نسبت ان رسمی دلائل کے جو قذف کے کوڑوں کے جواز میں پیش کئے گئے۔۔۔۔ صاحبو! جب کوئی مسئلہ ''مسئلہ'' بن جائے تو پھر اس کا حل بھی مل جاتا ہے۔ ہم متفحص اور زیرک دوستوں کی گفتگو سننے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یوں تو تہمت کا زہر مرد عورت کے لئے یکساں مہلک ہے لیکن عورت کے حق میں یہ کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے باعصمت خواتین کو فوقیت دی ہے۔ اسی تفوق سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ اگر مدعیہ عورت ہو تو اس سے چار گواہوں کا تقاضا نہیں کیا جانا چاہئے۔ یہ بڑی ہمت کی بات ہے کہ ایک عورت بھری عدالت میں جا کر بول اٹھے: ''کہ میری عزت لوٹ لی گئی ہے''۔ یہاں بھی گواہوں کی بجائے گواہیوں پر انحصار کیا جانا چاہئے۔ عدالت کرمنالوجی کے علوم سے مستفید ہوتے ہوئے خود نتیجہ اخذ کرے۔ اوپر بعض تفتیشی مآخذ کا ہم مجمل ذکر کر آئے ہیں۔ ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اس مقام پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ عورت کے ساتھ ایسا امتیازی سلوک کیوں؟ علامہ اقبالؒ بے اختیار یاد آئے ہیں۔ کہتے ہیں اگر بالفرض میں غیر مسلم ہوتا' مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ قرآن مجید صحیفۂ آسمانی ہے۔ اس کی معروضی خواندگی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچتا کہ یہ کتاب کسی عورت کی تصنیف ہے۔2

یہ درست ہے کہ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی بے راہ عورت پیروئ زلیخا میں کسی یوسفِ ثانی پر تہمت عائد کر دے۔ اگر عینی شاہد نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ قرآن جو شاہد ہے' کیا اس نے اس صورتحال میں بے جان 'دامن یوسف' کو شاہد ناطق نہیں بنا دیا؟ امرأۃ العزیز کے قبیلے کے ایک حق شناس کے قائم کردہ معیار کو (یوسف کا کرتا دیکھا جائے اگر آگے سے پھٹا ہوا ہے تو عورت سچی ہے۔ یوسف جھوٹا ہے اور اگر پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت نے جھوٹ بولا' یوسف سچا ہے 12/26-27) رب کریم نے کیا وقعت نہیں دی؟ کیا دستِ زلیخا سے نمٹنے کے لئے اب ایسا کوئی حق شناس روئے ارض پر موجود نہیں ہے؟۔۔۔ نیتیں اگر کج نہ ہو

گئی ہوں تو راستی کو پانا اب بھی مشکل نہیں ہے۔ منصف کی آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی ہوئی ہوتی۔ وہ چاہے تو سچائی کے جادے پر چلتے ہوئے حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔

آپ عورت کو یہ ریلیف دے کر تو دیکھیں۔ معاشرے میں موسمِ گُل ٹھہر جائے گا۔ پت جھڑ کی تعذیب تھم جائے گی۔ ہمارے آخری نبی حضرت محمد ﷺ نے عورت کو بہت اونچا مقام دیا ہے۔ اگر آپ بھی ان کی سنت کی پیروی میں عورت کی تکریم کریں گے تو عزت کا فیض سماج کے ہر فرد تک لازماً پہنچے گا۔ ہر فرد تک ہر مرد تک۔ مرد سے پھر یاد آیا کبھی کھلی آنکھوں سے اپنے اردگرد نظر دوڑا کر دیکھئے گا کہ کتنی عورتیں ہیں جو مردوں سے ناجائز تعلقات پروان چڑھانے والی ہیں اور کتنے مرد ہیں جو عورتوں کو پٹانے میں سرگرم عمل ہیں۔ یہاں تو ایسے مردوں کی بھی کمی نہیں جن کی کسی عورت کے ساتھ کوئی راہ ورسم نہیں ہوتی لیکن وہ ''شوقیہ اقراری مجرم'' ہوتے ہیں۔ کہانی میں خود کو ہیرو رکھ کر نام بنام عورتوں سے سانجھ سویرے اپنے ایمان شکن مراسم کی لذیذ وارداتیں سناتے نہیں تھکتے یوں اپنے ناکردہ گناہوں کا اعتراف کرتے چلے جائیں گے۔ یہ Boaster جی ہاں نفسیاتی مریض بعض اوقات افسانے کے مدار سے جست بھر کے باہر بھی آجاتے ہیں اور اعلانیہ Confession کر کے کسی پاک دامن بی بی کو اشتہار بنا دیتے ہیں۔ ایسے بیمار لوگ واقعی قابل علاج ہیں۔ اس کے برعکس کتنی عورتیں ہیں جو کسی مرد کے ساتھ Involve ہونے کے فرضی قصے گھڑتی پھرتی ہیں؟

☆☆☆

صاحبو! ۹ فروری ۱۹۷۹ء کو جو حدود آرڈیننس جاری ہوا' اسے آمرانہ انداز میں آئین کا حصہ بنا دیا گیا۔ قرآن مجید میں جن جرائم کی سزائیں خود خدا نے مقرر کی ہیں۔ اس آرڈیننس کے ساتھ ان کی کلی مطابقت نہیں ہے۔ قرآنی حدود کی روح کو مجروح کیا گیا ہے۔ دین اسلام کے پیش نظر انسان کی اصلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ معاشرے میں چوروں کی تعداد بڑھے اس لئے اس نے چوری کی سزا مقرر کر دی لیکن حد لگنے سے پہلے انہوں نے ایسے سماج کا نقشہ پیش فرمایا ہے جس میں ہر فرد کو عزت وآبرو کے ساتھ ضروریات زندگی نصیب ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتے کہ ان کے بندے جنسی آلودگی میں ملوث ہوں اس لئے انہوں نے کوڑوں کی سزا مقرر فرما دی تاکہ عصمتوں کی حفاظت ہو سکے لیکن اس سے پہلے انہوں نے یہ پلان متعارف کروایا کہ ہر شخص کو معاشی آسودگی میسر ہو تاکہ وہ بروقت شادی کر سکے۔ ساتھ ہی ساتھ پردے کی تاکید کی۔ غرض بھرکا سلیقہ سکھایا۔ اعلیٰ شعور کے پرنور خطوط کا مشاہدہ کروایا کہ اگر ان پر گامزن رہو گے تو تمہاری ذوات نشوونما پائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتے کہ ان کا کوئی بندہ دوسرے بندے کی گردن مارے کہ ان کی نظر میں ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ چنانچہ انہوں نے قصاص میں حیات سرمدی کا لہور قصاص کر دیا۔ مگر انہوں نے پہلے سلامتی کا ادراک بطور ارمغانِ الٰہی نازل کیا۔ ڈاکوؤں اور لٹیروں کی فوج دیکھ کر رب کریم مسرور نہیں ہوتے چنانچہ

لوگوں کے اموال کی حفاظت کی ضمانت مہیا کرنے کے لئے انہوں نے سوسائٹی کے ایسے باغیوں کے لئے سزائے موت تجویز کی۔ لیکن ان موالیوں کو یکا یک موت کے گھاٹ اتارنا نہیں شروع کر دیا بلکہ پہلے انہیں اسالیب حیات سے ایک زمانہ آگاہ کیا۔ انسانی جان و مال و آبرو کی اہمیت ان پر واضح کی۔ نظام ربوبیت کی برکات سے انہیں روشناس کیا۔ اس کے بعد جو Habitual Criminals اور offenders بچ گئے تھے اور اپنے سیاہ کرتوتوں سے باز نہیں آتے تھے خود ان کی بھلائی کے لئے معاشرے کو ان سے پاک کرنے کا حکم دے دیا۔ قاذف بہت اونچے درجے کا زنیم ہوتا ہے' ٹھیک ہے اللہ نے اس کے ساتھ نرمی نہیں فرمائی لیکن قذف کے مسموم نتائج واضح کر دینے کے بعد۔ ہاں عبث عیب جوئی کو ذہنی مرض بتا دینے کے بعد' انہوں نے آرڈر دیا ہے کہ ان مجرموں کو کوڑے مارو۔ مگر یہاں بھی ان کی شان رحیمی ہی نمایاں ہے کہ یہ کوڑا ان مجرموں کے ابدان کے لئے قابل برداشت ہو مگر ان بدنوں میں رواں روحیں ان کوڑوں کی تاب نہ لا سکیں۔ دراصل یہ ندامت کے تازیانے ہیں جو بالواسطہ جسم پر پڑتے ہیں اور براہ راست ضمیر پر پڑتے ہیں۔ اگر یہ کوڑے خفتہ ضمیروں کو بیدار کر دیں تو کیا یہ مجرموں کے محسن نہیں ہیں؟ آخر میں ہم یہی گزارش کریں گے کہ خدارا خدا کی حدود کا تمسخر نہ اڑوائیں۔ ان کا نفاذ نری حکومت کے ذریعے نہیں حکمت کے ذریعے ہوا کرتا ہے۔ اگر شاندار نتائج کا گوہر مراد پیش نظر ہے تو ان کی تنفیذ اسی طرح کیجئے جس طرح آخری رسول حضرت محمد ﷺ نے روح قرآنی کے مطابق کی تھی اور ایک بے نظیر معاشرہ قائم کر کے دکھا دیا تھا۔

توضیحات

1۔ فاضل مصنف ''تفسیر کبیر'' کے اس نقطہ نظر کا غالباً یہ مطلب بالکل نہیں کہ دو چار بار اگر کوئی زنا بالجبر یا زنا بالرضا کا مرتکب ہو جاتا ہے تو ثبوتِ جرم کے علی الرغم اسے معاف کر دیا جائے ہاں جب وہ عادی مجرم بن جائے تب اسے کڑی گرفت میں کس لیا جائے۔ ہم جہاں تک سمجھے ہیں وہ واضح صرف یہ کرنا چاہتے ہیں کہ الف لام کے اختصاص کے سبب الزانیہ اور الزانی سے ذہنی آوارگی کے شکار وہ اشخاص مراد ہیں جو اپنے اعمال قبیحہ و افعال شنیعہ میں بوجوہ دلیر ہو چکے ہوں۔ ان کے اعمال ناموں میں عمومی اخلاقی ضوابط سے اعلانیہ گریز پائی کی شہادتیں موجود ہوں۔ حیاشکنی کے سرعام مظاہرے ان سے سرزد ہو چکے ہوں۔ مثلاً مرد ہے تو عورتوں کا پیچھا کرنا' آوازے کسنا' فحش حرکات کرنا' افراد معاشرہ کی روک ٹوک کے باوصف اپنی ڈھٹائی اور سوقیانہ پن میں ترقی کرتے چلے جانا۔۔۔ عورت ہے تو جنسِ مخالف کو اپنی جانب راغب کرنا' حسن و جمال کی نمائش کرنا' قابل اعتراضات ملبوسات پہننا' کھلے بندوں غیر محرموں سے میل ملاپ رکھنا Meretriciously' آزادانہ گھومنا پھرنا' ناچنا گانا' چار دیواری کے تقدس کو خاطر میں نہ لانا' ماں باپ بھائی شوہر کی نافرمانی کرتے ہوئے اپنے ''دوستوں'' کے ساتھ آوارہ گردی کرنا

Companionate Marriage رچا لینا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ حتیٰ کہ ناجائز جسمانی تعلقات ایسے گھناؤنے جرم کو پھر خود سے فخریہ منسوب کرنا۔ گویا جن کے دیدوں کا پانی مکمل طور پر ڈھل چکا ہو وہ کرپٹ 'الزانی'' اور 'الزانیہ' کہلائے جانے کے حقدار ہوں گے۔

اب اپنے کالے کرتوتوں کے اس خوفناک ریکارڈ کے ساتھ یہ ناپاک جب ''تازہ واردات'' کے الزام میں دھر لئے جائیں گے تو بلاشبہ تحقیق وتفتیش نئے جرم کو مرکز مان کر ہی کی جائے گی اور اثباتِ جرم کی مطلوبہ شہادتیں ملنے پر ان کے ساتھ سخت ترین معاملہ کیا جائے گا۔ ہاں منصف کے لئے انہیں عبرت کا نشان بنا دینا ایک لحاظ سے ضروری ہو جائے گا اور دوسرے اعتبار سے آسان بھی ہو جائے گا کہ ان ملعونوں کا ماضی ان کے حال پر پختہ گواہ بن چکا ہوگا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ عادل کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ ملزمان کو ان کے ماضی کے تناظرات سے جدا کر کے نہ دیکھے۔ فیصلے میں بھلے تاخیر ہو جائے لیکن ان ملزموں کی تاریخ بالکل دیانتداری کے ساتھ ترتیب دے۔ یہاں ایک بہت لطیف ذوقی نکتہ پیش کرتے ہیں کہ وہ زنا کا مجرم شاید و باید ہی ثابت ہوگا جس نے مبادیاتِ زنا کے مراحل ماضی میں طے نہ کئے ہوں اور جو مقدماتِ زنا یعنی Obscenity میں آلودہ رہا ہوگا وہی آخری مرحلے میں ''سرخرو'' ہونے کے ''شرف'' سے ''مشرف'' ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی منشا یہی نظر آتی ہے کہ قانون خداوندی کے یہی بے خوف باغی بہرنوع بچ نہ سکیں تاکہ معاشرہ آبرو کے ساتھ جی سکے۔

ہاں اگر عورت اپنی ذات سے ہٹ کر معاشرے کے کسی عام فرد پر (بلاتخصیص مرد و زن) صریح الزام عائد کرتی ہے تو اس پر جنرل کوڈ کا اطلاق ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے علاوہ چار گواہ مہیا کرے۔ البتہ اگر عورت

I- اپنی بیٹی، بہن یا ایسے ہی کسی خونی رشتے میں بندھی خاتون کی بابت آ کر انصاف کی طالب ہوتی ہے کہ اس مجبور کے ساتھ فلاں جابر (Adulterer) نے کھلی کھلی زیادتی کی ہے اور وقوعہ مذکورہ کا اس کے سوا (یعنی درخواست گزار عورت کے سوا) کوئی عینی شاہد نہیں ہے۔

II- اپنے متعلق اقرار کرتی ہے کہ خود اس کے ساتھ ظلمِ عظیم ہو گیا ہے تو اس کے ساتھ استثنائی معاملہ کیا جانا چاہئے اور اس سے چار روایتی گواہوں کا تقاضا کرنے کی بجائے معاملے کو دیگر احوال وکوائف اور قرائن وظروف میں بے حد باریک بینی اور مکمل عدل کے ساتھ پرکھا جائے تاکہ کسی کے ساتھ انیائے نہ ہو۔

واضح رہے کہ یہ استثنا صرف Forcible Violation of A Woman یعنی زنا بالجبر کے ساتھ مخصوص ہونی چاہئے زنا بالرضا یا فریقین کے مابین Extra Marital Relationship اگر اپنے طور پر پروان چڑھے ہوں تو محولہ صدر رعایت سے انہیں مستفید ہونے کا اخلاق/اصولی حق نہیں پہنچتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس (کراچی)
فاضل درسِ نظامی

''قرآن فہمی وحدیث نبوی''

(موقر ماہنامہ ''محدث'' سے چند گذارشات)

معروف وموقر جریدہ ''محدث'' ملت اسلامیہ کا علمی و اصلاحی مجلّہ ہے۔ اس کے مدیر اعلیٰ جناب حافظ عبدالرحمٰن مدنی صاحب اور مدیر جناب حافظ حسن مدنی صاحب قابل احترام شخصیات ہیں۔ یہ مجلّہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' اہل حدیث حضرات کے نظریات و خیالات کا ترجمان ہے۔ اس ماہنامہ کے مارچ کے ایشو میں مولانا ابوعمار زاہد الراشدی صاحب دامت برکاتہٗ کا ایک مضمون ''قرآن فہمی اور حدیثِ نبوی'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مضمون اگرچہ مختصر ہے لیکن صاحب مضمون نے اپنا پورا مدعا اس میں بیان فرما دیا ہے۔ زبان بھی نہایت متین وسنجیدہ استعمال کی گئی ہے۔ مضمون ہذا میں رسالہ طلوع اسلام اور رسالہ اشراق کے قرآن فہمی کے اصولوں کی تنقیص کی گئی ہے۔ رسالہ 'محدث' ہو یا رسالہ جات ''طلوع اسلام'' و ''اشراق'' سب کا مطمح نظر قرآن کریم کو صحیح طور پر سمجھنا اور اس کی تعلیم کو عام کرنا ہے اس مطمح نگاہ اور مقصد میں سب متفق ہیں اور حتی الامکان اپنی اپنی جگہ قرآن کریم کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ البتہ سوچ کے طریقوں اور قرآن فہمی کے اصولوں میں اختلاف ہے۔ لیکن ہم سب مسلمان ہیں۔ قرآن کریم کے خادم ہیں۔ ہمیں ان اصولوں کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے سے مغائرت ومنافرت کرنا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کی عزت کریں اور قرآن فہمی میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ آج مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں اور جن مصائب میں گھرے ہوئے ہیں شاید چودہ سو سال میں مسلمانوں پر اس سے برا وقت کبھی نہیں آیا ہوگا ان موجودہ حالات کے پیش نظر آپس میں تعاون وتنافر وقت کی اور بھی زیادہ ضرورت بن گیا ہے۔

قرآن فہمی کے اصولوں اور قواعد کے سلسلہ میں محترم پرویز صاحب علیہ الرحمتہ اور محترم جاوید غامدی صاحب کے حوالے سے مضمون میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس

کا خلاصہ یہ ہے کہ جناب خورشید ندیم صاحب پرویز صاحب کے قرآن فہمی کے اس طریقہ کو پسند نہیں فرماتے جس کی رو سے وہ قرآن کریم کو صرف لغت کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کے برخلاف طلوع اسلام' جناب جاوید غامدی صاحب کے طریقہ کو کہ ''وہ قرآن کو جاہلی دور کے عربی ادب اور شعر و شاعری کے ذخیرے کی بنیاد پر سمجھنا چاہتے ہیں'' درست خیال نہیں کرتا۔ مضمون کو مزید واضح کرنے کے لئے تحریر کیا جاتا ہے کہ (بقول راشدی صاحب) پرویز صاحب مرحوم قرآن کریم کو صرف لغت کے حوالے سے سمجھتے تھے اور جناب غامدی صاحب قرآن کریم کو جاہلی دور کے عربی ادب اور شعر شاعری کے ذخیرے سے سمجھنا چاہتے ہیں' جبکہ طلوع اسلام اور اشراق' دونوں ہی ایک دوسرے کے طریقہ کو درست قرار نہیں دیتے۔ ان دونوں حضرات کے قرآن فہمی کے طریقوں کے اختلاف سے صاحب مضمون فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ صاحب مضمون کا یہ نظریہ ہے کہ ان دونوں ہی حضرات کا قرآن فہمی کا طریقہ غلط ہے۔ وہ یعنی صاحب مضمون' لغت اور ادب جاہلی اور محاوروں کو اہمیت تو دیتے ہیں' ان کی اہمیت سے صرف نظر نہیں فرماتے' لیکن یہ خیال فرماتے ہیں کہ یہ دونوں سہارے قرآن فہمی کے لئے کافی نہیں ہیں۔

اس مضمون کو سمٹانے اور مختصر کرنے کی غرض سے 'محدث' میں طبع شدہ مضمون کا ملخص بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ورنہ طول طویل اقتباسات نقل کرنے سے مضمون بھی بہت لمبا ہوتا ہے اور ان کا مطالعہ بھی قارئین پر گراں گذرتا ہے۔ اب خود صاحب مضمون جناب راشدی صاحب کا نقطہ نظر تحریر کیا جاتا ہے اور اس پر تبصرہ بھی۔ نیز راشدی صاحب کا نام بھی مختصر تحریر کیا گیا ہے ورنہ حضرت اقدس کا پورا نام مولانا ابوعمار زاہد الراشدی تحریر کیا گیا ہے۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں حضرت مولانا راشدی صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے متکلم کی منشاء تک رسائی ضروری ہے۔ اس کیس میں اللہ تعالیٰ متکلم ہے۔ لیکن اس تک براہ راست رسائی ممکن نہیں ہے کہ اس سے دریافت کیا جا سکے کہ آپ کی اس بارے میں کیا مراد ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نمائندے تک تو ہماری رسائی ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی اللہ تعالیٰ کی نمائندہ ہے جن کا مشن ہی یہ تھا کہ 'اللہ تعالیٰ کا پیغام ہم تک پہنچائیں اور اس کی وضاحت کر کے ہمیں اللہ تعالیٰ کی منشاء سے آگاہ کریں'۔ اس کے بعد حضرت نہایت معصومانہ انداز میں اس حیرت و استعجاب کا اظہار فرماتے ہیں کہ 'جبکہ قرآن کریم امت تک جن ذرائع سے پہنچا ہے وہی ذرائع اس کی تشریح یعنی جناب نبی اکرم کے ارشادات و فرمودات کو ہم تک منتقل کر رہے ہیں۔ اگر وہ ذرائع قرآن کریم کو امت تک منتقل کرنے میں قابل اعتماد ہیں تو حدیث و سنت کو امت تک پہنچانے میں کیوں قابل اعتماد نہیں ہیں۔ اگر وہ حدیث و سنت کی روایت میں خدانخواستہ قابل اعتماد نہیں ہیں تو قرآن کریم کی روایت میں کس طرح قابل اعتماد ہو جاتے ہیں'۔ (اقتباس ختم)۔ غرض کہ اصل نظریہ حضرت کا وہی روایت پرستی کا حامل ہے کہ قرآن کریم کو روایت کے

ذریعے سمجھا جائے اور تفسیر القرآن بالروایات کا جو رواج طریقہ ہمارے ہاں چلا آ رہا ہے' اسی طریقہ کو جاری رکھا جائے۔

جو اعتراض حضرت نے معصومانہ سوال کے پیرائے میں تحریر فرمایا ہے اس سلسلہ میں بنیادی بات جو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم پر ہم ایمان لاتے ہیں۔امن الرسول بما انزل الیہ والمومنون (2/285)۔(ہمارے) پیغمبر جو کچھ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے' اسی پر ایمان لائے اور انکے ساتھ مومنین بھی۔قرآن کریم کی ایک ایک آیت پر ہمارا ایمان ہے۔لیکن احادیث کی یہ پوزیشن نہیں ہے۔کس قدر ذخیرہ احادیث پر ایمان لانا ضروری ہے' اور کس قدر پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔قرآن کریم پر ایمان لانے کے بعد پھر سوال ہی باقی نہیں رہتا کہ یہ قرآن جو 6 ہزار سے زیادہ آیات پر مشتمل ہے کن ذرائع سے ہمارے پاس آیا' اس کے برخلاف احادیث کا یہ مقام نہیں ہے۔ہم احادیث پر نہ تو ایمان لانے کے مکلف ہیں اور نہ ہی احادیث کو من وعن تسلیم کرتے ہیں۔احادیث کے قبول وترد ید کے بارے میں ایک پورا علم ایجاد کیا گیا۔ایک ایک حدیث کی جرح وتعدیل کی گئی۔اسماء الرجال کا علم بنایا گیا۔ایک ایک راوی کے پورے پورے حالات جمع کئے گئے۔سینکڑوں ہزاروں کتابیں اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کے بارے میں تصنیف کی گئیں۔اگر قرآن وحدیث کے ذرائع دونوں ایک جیسے باوثوق تھے تو یہ اس قدر تفاوت کیوں ہے کہ قرآن کریم کی کسی آیت کو روایت و درایت کی کسوٹی پر نہیں تولتے جبکہ ہر ہر حدیث کو روایت و درایت کے Process سے گزرنا پڑتا ہے۔یہ روایت و درایت کا علم نہ تو پرویز صاحب مرحوم نے ایجاد کیا اور نہ ہی محترم غامدی صاحب کی ایجاد ہے۔ہمارے علماء کرام نے خود ہی ان ذرائع میں امتیاز پیدا کیا ہے۔قرآن کریم کی ایک ایک آیت کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔جب تک کہ ہر ہر حدیث پر تنازع عام اصول ہے۔قرآن کے ذرائع کو خود بخود تسلیم کرنا' اور احادیث کے ذرائع کو خود مشکوک سمجھ کر ان کی چھان بین کرنا' خود صاف ظاہر کر رہا ہے کہ ان دو ذرائع میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

تاکید مزید و تائید متین کے طور پر تحریر ہے کہ ہمارے نزدیک قرآن وحدیث کے صحیح واصلی مقامات و باہم امتیازات یہ ہیں کہ قرآن کریم پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔قرآن کریم جس رسول امین پر نازل ہوا' اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔قرآن کریم جس روح الامین کے ذریعے نازل ہوا' اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔قرآن کریم کو جس معبود نے اتارا' اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔لیکن اس کے برخلاف نہ حدیث پر ہمارا ایمان ہے' نہ اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے' نہ حدیث کے رواۃ پر ہمارا ایمان ہے نہ ان پر ایمان لانے کا حکم ہم کو دیا گیا ہے۔نہ حدیث کی سند میں جو رجال ہیں' ان پر ہمارا

ایمان ہے نہ ان پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے اس قدر افتراق و امتیاز کے باوجود یہ کس طرح مناسب ہے کہ ایسی غیر یقینی اور غیر ایمانی چیز کو ہم قرآن کی طرح دینی حجت قرار دے لیں۔

اس ساری گفتگو میں اصل نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کے اصول وقواعد کیا ہیں اور اب تک جن اصولوں سے تفسیر قرآن کی جاتی رہی ہے یعنی تفسیر القرآن بالروایات' اور جس کی تائید و تاکید حضرت مولانا راشدی صاحب نے بھی فرمائی ہے اسی طریقہ کو جاری رکھا جائے یا یہ خیال کرتے ہوئے کہ ان اصولوں سے قرآن کی تفسیر کر کے' قرآن کریم کی صحیح تعلیم سامنے نہیں آتی' اور جو تعلیم آج تک سامنے آئی ہے' اس پر عمل کر کے' مسلمانوں کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہی ہوتی جا رہی ہے لہٰذا ان آزمودہ اصولوں کے بجائے خود قرآن کریم کے متعین شدہ اور مقرر کردہ اصولوں سے ہی کیوں نہ استفادہ کیا جائے' اور ان کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر کر کے' خالص قرآنی تعلیم حاصل کی جائے۔

ہمارے ہاں قرآن کریم کی تفاسیر تصنیف کرنے سے پیشتر تفسیر کرنے کے اصول متعین نہیں کئے گئے تھے بلکہ اصول وقواعد مقرر و متعین کئے بغیر ہی تفاسیر تحریر کرنے کا سلسلہ جاری کر دیا گیا تھا۔ سب سے پہلی تفسیر جو ہمارے دینی لٹریچر میں اس وقت موجود ہے وہ تفسیر طبری ہے جو تقریباً 300 ہجری کے قریب میں تحریر کی گئی ہے اور اس کے بعد جس قدر تفاسیر تحریر کی گئیں اکثر کا دارومدار اور انحصار اسی تفسیر پر رہا اور اسی اصول کے تحت تفاسیر تحریر کی گئیں۔

ابتداء سے ہی تفسیر کرنے کا یہ طریقہ چلا آ رہا ہے کہ سب سے پہلے آیۂ کریمہ کا شان نزول تلاش کیا جاتا ہے۔ قرآن فہمی کی راہ میں شان نزول کو اس قدر اہمیت دینا ہی ہمارے نزدیک قرآن فہمی میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہے۔ ہر آیت کے شان نزول میں یہ تلاش کیا جاتا ہے کہ یہ آیت فلاں یہودی کے حق میں اتری تھی اور یہ فلاں منافق کے بارے میں۔ یہ آیت فلاں صحابی کی شان میں نازل ہوئی اور یہ آیت اہل بیت کے فلاں محترم فرد کے لئے نازل ہوئی اور اس طرح قرآنی احکامات کی عمومیت' عالمگیریت اور ابدیت کو جو قیامت تک پوری نوع انسانی کے لئے تھیں' صرف چند افراد تک محدود کر کے رکھ دی گئی ہیں' شان نزول کا عقیدہ قرآن فہمی میں اس طرح رکاوٹ بن کر سامنے آتا ہے کہ یہ کسی بھی آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی طرف آنے ہی نہیں دیتا اور صورت حال یہ ہوتی ہے کہ آیت تو لے لی قرآن سے' اور شان نزول روایات میں ڈھونڈھنا شروع کر دیا۔ ایک ہی آیت کے دو' تین' چار' پانچ شان نزول بیک وقت روایات میں مندرج ہیں اور وہ خود اس قدر شک وشبہ اور تضاد سے پر و مملو ہوتے ہیں کہ یقینی بات کا علم ہی نہ ہو سکے۔

ہمارے مفسرین کرام نے شاید اس نکتہ پر غور نہیں فرمایا کہ بعض اوقات کئی سورتیں بیک وقت پوری پوری بھی نازل ہوتی ہیں' سورہ نور کے بالکل شروع میں ارشاد ہوا سورۃ انزلنا ..... (21/1)۔ یہ ایک سورۃ ہے

جسے ہم نے نازل کیا اس کے احکام کو فرض کر دیا اور اس میں ہم نے واضح روشن آیتیں نازل کی ہیں۔

اس سورہ مبارکہ میں 64 آیات کریمات ہیں۔ اگر آیات کسی سبب یا واقعہ کے باعث نازل ہوتی تھیں تو یہ پوری سورۃ بیک وقت کیسے نازل ہوگئی۔ شان نزول کے عقیدہ کے مطابق تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مختلف اوقات میں مختلف 64 واقعات رونما ہوئے تو یہ سورہ سب واقعات کا احاطہ کر کے نازل ہوئی ہے۔ لیکن یہ صورت معاملہ بالکل عجیب وغریب سی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک تو قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور اس کی تدبیر امور کے مطابق نازل ہوا' وقتی حادثات وواقعات یا چند مخصوص افراد وشخصیات کی وجہ سے قرآن کریم کی آیات کا نزول نہیں ہوتا تھا۔ غور کرنے کی یہ بات ہے کہ اگر وہ واقعہ رونما نہ ہوتا تو کیا وہ آیت نازل نہ ہوتی۔ یا اگر زیادہ واقعات رونما ہو جاتے تو کیا آیات کریمات کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جاتا۔ اگر واقعہ افک' قصہ مباہلہ' قصہ زید' واقعہ غدیر وغیرہ رونما نہ ہوتے تو یہ آیات نازل نہ ہوتیں' قرآن کریم از اول تا آخر' سورۃ بقرہ سے لے کر سورہ والناس کے آخر تک یقینی ہے۔ اس کی جملہ آیات یقینی وحتمی ہیں۔ جب کہ شان نزول اور روایات بالکل ظنی اور غیر یقینی ہیں۔ اس صورت میں آیات کی تفسیر کا مدار وانحصار روایات اور شان نزول پر رکھنا' بالکل غیر مناسب اور عقل کے خلاف ہے اور آیات کے مفہوم کو بھی غیر یقینی اور ظنی بنانا ہے۔

قرآن کریم ایک مکمل ضابطۂ حیات اور اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ بے مثال دین ہے۔ جس کے مطابق زندگی بسر کرنا ہر مسلمان کا فرض اولین ہے۔ یہ وہ ضابطۂ حیات یا نظام زندگی ہے جو ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتا ہے اور جس کے مطابق ہمارے اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس نظام کو اختیار کرنے سے ہر مسلمان دوسرے انسانوں کی محکومی سے آزاد ہو کر صرف اور صرف قوانین خداوندی کا محکوم ہو جاتا ہے۔ اس نظام کو حضور ﷺ نے اپنے دور ہمایوں میں جاری فرمایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے والے نہ صرف تمام دیگر اقوام پر غالب آ گئے بلکہ ایک ایسا معاشرہ وجود پذیر ہوا کہ جس میں انسانیت نے اطمینان وسکون کا سانس لیا۔ انسان کے استحصال کرنے کے تمام ذرائع (Exploitation of man by man) بند کر دیئے گئے اور وہ نظام ربوبیت جاری ہوا' جس کا جاری کرنا انسانیت کا مقصد اعلیٰ ہے۔ لیکن انسانیت کی بدبختی کہ وہ نظام زیادہ عرصہ جاری نہیں رہ سکا۔ جس کے دیگر اسباب کے علاوہ سب سے بڑا سبب ملوکیت کا غلبہ تھا۔ ملوکیت نے غلبہ پا کر اس نظام کو ختم کر دیا اور مستقلاً بادشاہت قائم کر دی جو کہ قرآن کریم کی رو سے قطعاً حرام ہے۔ لیکن قرآن کی اس واضح تعلیم کے باوجود کہ بادشاہی حرام ہے' ظالم' فاسق' بدچلن' آوارہ مزاج اور اوباش بادشاہ تلوار کے زور پر امت کی گردنوں پر سوار ہو گئے اور جمہور مسلمانوں کا حق غصب کر کے اپنی بادشاہت قائم رکھی۔ ملوکیت نے اس نظام کو تو ختم کر دیا لیکن نام اسلام کا ہی استعمال کرتے رہے۔ اس کو

خلافت کے نام سے نامزد کرتے رہے' اور اپنے آپ کو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کے القاب سے موسوم کرتے رہے' یہ مسلمانوں کا تاریک ترین دور تھا' اور اس تاریک ترین دور میں ہمارا سارا دینی لٹریچر وجود میں آیا۔ عام اس سے کہ وہ فقہ و اصول فقہ ہوں یا احادیث و تفاسیر کے مجموعے۔ اس دور میں چونکہ دین کا تصور ختم ہو چکا تھا اور اسلام صرف مذہب کی حیثیت سے رہ گیا تھا۔ اس لئے اس دور میں جس قدر تفاسیر تحریر کی گئیں وہ بطور مذہب کے تحریر کی گئیں' وہ قرآن کریم کو بحیثیت دین کے پیش نہیں کرتیں۔ اب جبکہ انسانیت اپنے تجویز کردہ نظامہائے حیات سے تنگ آ کر اور خود مسلمان بھی دنیا کی ذلت و خواری کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو کر قرآن کی طرف آ رہے ہیں تو یہ تفاسیر ان کے سامنے قرآن کریم کو بطور مذہب کے پیش کرتی ہیں' ایک مکمل نظام حیات کے طور پر پیش نہیں کرتیں اور نہ ہی وہ ان کی موجودہ مشکلات و مصائب کا حل اپنے اندر لئے ہوئے ہیں جن کا حل خود قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ ان تفاسیر کی وجہ سے مسلمان پھر قرآن سے بدظن ہو رہے ہیں اور موجودہ نسل مزید دور ہوتی جا رہی ہے کیونکہ ان ہی تفاسیر کے سبب تو مسلمان تباہ و برباد ہوئے ہیں۔ ہمارا ایک ہزار سال کا لٹریچر مسلمانوں کے مجبور' مقہور' ذلیل و خوار ہونے کا ذمہ دار ہے۔ آج اس امر کی شدید ترین ضرورت ہے کہ وہ تفاسیر و شہ پارے مہیا کئے جائیں جن میں قرآن کریم کی خالص تعلیم ہو اور جن میں قرآن کریم کو بطور دین کے پیش کیا گیا ہو۔ لیکن یہ تفاسیر روایات کے ذریعے تحریر نہیں کی جا سکتیں مزید یہ کہ ؎

نیست این کارِ فقیہاں اے پسر

یہ تفاسیر تو وہ ہی خوش قسمت لوگ تحریر کر سکتے ہیں کہ جن کے سامنے صرف قرآن خالص ہو اور اس کا نظام حیات اور موجودہ دور کے علوم و مسائل پر گہری نظر۔ نہ کہ ملوکیت و بادشاہت اور ایک ہزار سال کے دقیانوسی علوم پر اصرار و اعتماد۔

تفسیر بالروایات کے طریقہ میں کہ جس کی تائید و توصیف حضرت مولانا راشدی صاحب فرما رہے۔ ان عیوب و اسقام کے علاوہ ایک بہت بڑا نقص یہ بھی ہے کہ یہ تفاسیر نسخ کے عقیدے کی حامل ہیں جس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن کریم میں کسی بات کا حکم کر دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل فرما دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا یہ حکم اس سے پہلے حکم سے بہتر ہوتا تھا۔ لیکن حیرت کی یہ بات ہے کہ اس نئی آیت میں یہ نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ کیا جاتا ہے۔ اس لئے اب قرآن کریم میں منسوخ آیات بھی ہیں اور ناسخ آیات بھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ کون سی آیت کس آیت سے منسوخ اور کون سی آیت کس آیت کی ناسخ ہے۔ یہ ناسخ و منسوخ آیات کی نشاندہی روایات کے ذریعے ہمارے مفسرین کرام نے کی ہے۔ چنانچہ ناسخ و منسوخ آیات کی تعداد میں اضافہ و کمی ہوتی رہی ہے۔ جو حضرات عقیدہ نسخ کے قائل تھے ان کی تو کوشش یہی

ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ آیات کو منسوخ دکھایا جائے۔ لیکن شاہ ولی اللہ صاحب محدثؒ دہلوی نے ان کی تعداد کم کرتے کرتے صرف 5 تک رہنے دی ہے۔ اس عقیدے کی رو سے آپ خود غور فرمالیں کہ اللہ تعالیٰ اور قرآن کریم کے متعلق کس قسم کا تصور باقی رہ جاتا ہے۔

نسخ کے سلسلہ میں اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ سورہ النساء کی مشہور آیۂ کریمہ نمبر 15 کے مطابق زانی کی سزا کے لئے ۴ عینی گواہوں کا شہادت کے لئے ہونا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس آیت میں تعزیر ''پابند مسکن'' کرنا ہے۔ یعنی اس عورت کو مکان سے باہر جانے سے روک دیا جائے۔ لیکن ہمارے ہاں فقہ میں زنا کی سزا سو کوڑے ہے جو قرآن کریم کے مطابق ہے۔ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ ''اگرچہ یہ تعزیرات سورہ نور میں نازل شدہ حدود کے ذریعے منسوخ ہوگئیں لیکن بدکاری کے معاملے میں شہادت کا یہی ضابطہ بعد میں بھی باقی رہا'' (تدبر قرآن)۔ یعنی آیۂ کریمہ کا ایک حصہ یعنی زنا کی سزا تو منسوخ ہوگیا' لیکن دوسرا حصہ' شہادت کا ضابطہ (یعنی 4 عینی گواہوں کی موجودگی) بعد میں بھی باقی رہا۔ یاللعجب۔

ہمارے ہاں جس قدر تفاسیر تحریر کی گئی ہیں اور جو بھی تفسیری لٹریچر وجود میں آیا' ان سب کی اساس' اس بے بنیاد عقیدے پر ہے کہ حضور علیہ السلام کو وحی جلی (قرآن کریم) کے ساتھ ساتھ وحی خفی (احادیث) بھی ہوتی تھی اور حضورﷺ قرآن کریم کی آیات کی جو تفسیر فرماتے تھے وہ اسی وحی خفی کی بنیاد پر فرماتے تھے۔ اپنے غور وفکر' تدبر وتعقل سے نہیں فرماتے تھے۔ اسی وحی خفی کی بنیاد پر ان آیات کی تفسیر کی گئی جو حضورﷺ سے عرصۂ دراز پیشتر سے متعلق تھیں' مثلاً حضرت آدمؑ کا قد' ان کا لنکا میں ہبوط' حضرت نوحؑ کی کشتی کی پیمائش' کشتی میں سوار جوڑوں کی تفاصیل' حضرت نوح کا عبدالغفار نام ہونا' حضرت مریمؑ کے ہاں جو کھانے آتے تھے ان کے نام' ام موسیٰ سے متعلق صدہا روایات یا آئندہ سے متعلق بے شمار روایات' دجال' دابتہ الارض' نزول مسیح' اس کی ساری تفاصیل کہ انہوں نے گیروی رنگ کا لباس زیب تن کیا ہوگا' اس سے کچھ وقت پہلے غسل کیا ہوگا اور پانی کے قطرے ان کے بالوں سے ٹپک رہے ہوں گے۔ آمد مہدی سے منسوب روایات' ان سب کا تعلق و مدار وحی خفی کے عقیدے پر ہے۔ لیکن اگر یہ عقیدہ کہ حدیث بھی قرآن کی مثل وحی ہے' غلط قرار دے دیا جائے' تو ہماری تفاسیر کا بیشتر حصہ خود بخود ساقط اور مرفوع القلم ہو جاتا ہے اور اس بیشتر حصۂ تفاسیر کی اہمیت ایک پرکاہ کے برابر بھی نہیں رہتی۔

وحی خفی کا عقیدہ ہمارے علماء کرام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے صدر اول میں اس عقیدہ کا کوئی نام ونشان نہیں تھا' تقریباً دوسو سال کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا۔ ہمارے علماء کرام' پاکستان میں جس جس طبقہ فکر کو بھی استحقاراً و استخفافاً ''منکرین حدیث'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ وحی خفی کا انکار ان سب میں مشترک ہے۔ اس طبقہ کا بیشتر حصہ حدیث کا منکر نہیں ہے' بلکہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو' اس کو سرآنکھوں پر جگہ دیتے ہیں' انکار حدیث کا الزام ان کے

ذمہ غلط ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ حدیث کو وحی تسلیم کرنے پر کسی طرح بھی آمادہ نظر نہیں آتے۔ ہمارے علماء کرام نے ان نام نہاد ''منکرین حدیث'' کے خلاف تقریباً تین سو سے زیادہ کتب تصنیف فرمائی ہیں۔ اور تقریباً ہر فرقہ نے ہی تصنیف کی ہیں۔ جن میں نام نہاد ''منکرین حدیث'' کے ایک ایک نظریہ کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے' حدیث کی حمایت میں بہت تفصیل سے صحاح ستہ کے مصنفین کے حالات رقم کئے۔ عربوں کے حافظوں کی بڑی تعریف کی کہ ان کے حافظے اس قدر مضبوط تھے کہ انہوں نے احادیث کو نقل کرنے میں بہت کم غلطیاں کی ہیں۔ السماء الرجال کے متعلق بہت مواد مہیا کیا لیکن جو اصل موضوع ہے اور جو سب ''منکرین حدیث'' کا اصل الاصول اور عروۃ الوثقیٰ ہے کہ حدیث وحی نہیں ہے اور ''وحی صرف قرآن میں ہے'' اس موضوع پر کچھ تحریر کرنے سے ہمارے علماء کرام ہمیشہ بچتے رہے اور اجتناب کرتے رہے ہیں۔ کمترین راقم سطور نے اس موضوع پر ۶ مفصل مضامین تحریر کئے جو عرصہ دراز پیشتر طلوع اسلام میں طبع ہوئے تھے۔ پھر گزشتہ دو سال قبل 'محدث' کے ''انکار حدیث نمبر'' پر تبصرہ رسالہ ہذا میں طبع ہوا۔ اس مضمون میں بھی راقم سطور نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ ہمارے علمائے کرام حدیث کو وحی ثابت کرنے کے لئے مضمون تحریر کرنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ لیکن تا حال کسی رسالہ' یا کتاب' یا 'محدث' میں ایسا مضمون تحریر نہیں کیا گیا جس میں حدیث کو وحی خفی ثابت کیا گیا ہو۔ اس مضمون میں پھر اسی درخواست کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے علماء کرام حدیث کے وحی ہونے پر کوئی ایسا جامع ومبسوط مضمون تحریر فرمائیں تاکہ نام نہاد ''منکرین حدیث'' کو اپنے موقف پر دوبارہ غور کرنے کا موقع فراہم ہو۔

اس مضمون میں یہاں تک تفسیر بالروایات کے سُقم اور عیوب کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اب حضرت مولانا راشدی صاحب کی توجہ اس طریقہ کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جس طریقہ سے قرآن کریم کی تفسیر کرنی چاہئے اور اس میں روایات کا سہارا لینے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یہ بات حضرت نے یقیناً درست فرمائی ہے کہ قرآن فہمی کے لئے وہ متکلم کے منشا تک رسائی کی کوشش کی جائے''۔ لیکن ان کے خیال سے کیونکہ متکلم یعنی اللہ تعالیٰ تک ہماری رسائی نہیں ہے کہ اس سے اس کی مراد معلوم کرسکیں' اس لئے حضرت کا خیال ہے کہ اس نمائندے یعنی حضورﷺ تک رسائی حاصل کی جائے' اور اسکا طریقہ یہ ہے کہ احادیث کے ذریعے قرآن کریم کو سمجھا جائے' اس سے متکلم یعنی اللہ تعالیٰ کا منشاء معلوم ہو جائے گا۔ لیکن ہمارے نزدیک احادیث کے ذریعے متکلم (اللہ تعالیٰ) کا منشاء معلوم نہیں ہو سکتا اور نہ ہی سابقہ تفاسیر سے منشاء خداوندی معلوم ہوسکتا ہے۔ منشاء خداوندی معلوم کرنے کا واحد ذریعہ صرف قرآن خالص کو پیش نگاہ رکھ کر' ہر دور کی علمی سطح تک علوم حاصل کر کے' قرآن کریم میں غور وفکر کرنا ہے۔ موجودہ دور میں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ فکر انسانی مختلف علوم میں مجموعی طور پر کہاں تک پہنچا ہے اور قرآن کریم اس کو کہاں تک لے جاتا ہے' اور جن مسائل کا حل فکر انسانی تلاش کرنے سے بالکل عاجز وقاصر

ہے اور اب تک بالکل ناکام رہی ہے' قرآن کریم ان مسائل کے کیا حل (Solution) پیش کرتا ہے۔

اگر بایں نر سیدی تمام بولہبی است

قرآن کریم نے قرآن فہمی کے جو اصول خود متعین فرمائے ہیں' مقام حیرت ہے کہ ہمارے مفسرین کرام نے ان کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا' قرآن فہمی کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کے وہ Original معنے لئے جائیں جو نزول قرآن کے وقت ان کے معانی لئے جاتے تھے۔ کیونکہ یہ قرآن عربوں کی اس زبان میں نازل ہوا ہے جو زبان وہ اس وقت بولتے تھے فو رب السماء والارض انه' لحق' مثل انتم تنطقون (51/27)۔ ''پس زمین و آسمان کا رب گواہ ہے کہ بیشک یہ قرآن سچ ہے اور اس کے مانند و مثل ہے جو کچھ کہ تم بولتے ہو۔'' قرآن کریم کا انداز بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح تم گفتگو کرتے ہو۔ اس لئے قرآن کریم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے محاورہ عرب کا خیال رکھنا اور اس پر مہارت و ممارست' اور عبور ہونا ضروری شرط ہے۔ اسی کے الفاظ کی حاکمیت کو قائم رکھا جائے اور اس کے مطابق اس کا مفہوم اخذ کیا جائے۔ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے جو چیز سب سے زیادہ مفید ہوتی ہے وہ اس دور کی زبان و ادب کا نہایت گہرا مطالعہ اور اس پر مضبوط گرفت ہوتی ہے۔ جس شخص کی گرفت اس دور کے ادب پر جس قدر زیادہ مضبوط ہو گی' اسی قدر وہ قرآن کریم کی صحیح تعبیر حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔

(2) قرآن کریم وحی الٰہی ہے۔ اس کا ایک اپنا منفرد انداز ہے' اس کا اپنا انداز عام انسانی تصانیف کا سا نہیں ہے کہ اس میں اپنے مدعا کو آسان بنانے کی خاطر کتاب کو مختلف موضوعات میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور جس موضوع کے متعلق جو کچھ کہنا ہو' اس کو متعلقہ باب میں پورا پورا بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس سے کتاب کے مشمولات و محتویات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کریم کا اپنا ایک مخصوص اسلوب ہے۔ اس میں ایک حقیقت اگر ایک مقام پر بیان کی گئی ہے تو اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام اور بعض اوقات دوسرے مقامات میں آئی ہے۔ ان میں کسی جگہ اضافہ کیا گیا ہے اور کسی جگہ استثناء بعض اوقات بعض مشکل و اہم حقائق کو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لئے انہیں سیاق و سباق کی روشنی میں' مختلف مقامات پر دہرایا گیا ہے۔ قرآن کریم کے اس اسلوب کو ''تصریف آیات'' کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی موضوع کو سمجھنے کے لئے' اس موضوع سے متعلق تمام آیات کو پیش نظر رکھا جائے اور اس طرح تصریف آیات' یعنی آیات کو بار بار سامنے لانے سے' قرآن کریم سمجھ میں آ جاتا ہے' قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے تصریف آیات خود قرآن کا متعین کردہ طریقہ ہے جب کہ اس نے فرمایا کہ انظر کیف نصرف الآیات ..... (6/46)۔ ''دیکھو کس طرح ہم آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں مگر وہ پھر بھی اعراض کرتے ہیں'' اس آیت سے واضح ہے کہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے تصریف آیات لازمی چیز ہے۔ اور جو قرآن فہمی میں تصریف آیات سے کام

نہیں لیتا وہ قرآن کریم سے اعراض کرتا ہے۔ یعنی قرآن کریم سمجھنے کے لئے تصریف آیات کے قرآنی اسلوب کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرنے کو قرآن کریم فرار کی راہ قرار دیتا ہے۔ خود قرآنی ہدایات کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر و تفہیم کا واحد ذریعہ تصریف آیات ہے۔

اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ حضورﷺ خود قرآن کریم کی تفسیر کس طرح فرماتے تھے کیا آپ کا قرآن فہمی کا طریقہ تفسیر بالرائے پر مبنی تھا؟ اس کے متعلق خود قرآن کریم نے فرمایا کہ وکذلک نصرف الآیات ولیقولوا درست .....(6/105)۔ ''اور اے رسول ہم اسی طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تاکہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیا کریں) اور تاکہ لوگ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا ہے (اور تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تاکہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیتوں کی خود تبیین کر دیں۔'' پس یہ بات ثابت ہوئی کہ حضور اس قرآنی حکم کے مطابق تصریف آیات ہی کے ساتھ درس قرآن دیا کرتے تھے۔ یعنی قرآن فہمی کا طریقہ آپ کا بھی تصریف آیات ہی تھا۔

(3) یہ کائنات اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور دونوں کے لئے فرمایا گیا کہ ان کو بالحق پیدا کیا گیا ہے۔ خلق السموٰت والارض بالحق (63/3)۔ اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے نزل علیک الکتب بالحق (3/7)۔ اے رسول اللہ نے آپ پر اپنی کتاب بالحق نازل فرمائی ہے۔ جس طرح قرآن کے فقرات کو اللہ تعالیٰ نے آیات کہا ہے اسی طرح کائنات کی اشیاء کو بھی اللہ تعالیٰ نے آیات فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ کشتی کو آیت کہا ہے (36/41)۔ اسی طرح حضرت نوح کی کشتی کو ایۃً للعالمین کہا ہے 29/15۔ ایک جگہ ارشاد ہوا وجعلنا اللیل والنھار آیتین 17/12۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا قول اور کائنات اس کا فعل ہے۔ ان میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم کی کوئی آیت' کتاب کائنات کی کسی آیت کے مخالف نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء فاخرجنا ثمرٰت مختلفا الوانھا 35/27۔ اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برساتا ہے پھر ہم (خدا) نے اس سے طرح طرح کے رنگوں کے پھل پیدا کئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق ہم آسمان سے عملی طور پر پانی برستا اور مختلف رنگ کے میوہ جات پیدا ہوتے دیکھتے ہیں اور اس طرح اس کے قول و فعل میں مطابقت دیکھتے ہیں۔ اس طرح قرآن فہمی میں یہ بات بہت مددگار ثابت ہوتی ہے کہ جس طرح کائنات میں غور و فکر کرنے کے لئے مختلف علوم کے ماہرین اپنی پوری پوری عمریں کھپا دیتے ہیں۔ اسی طرح قرآن فہمی کے لئے بھی ضروری ہے کہ مختلف علوم کے ماہرین قرآن کریم کی ان آیات پر غور کریں جو ان کے علوم سے متعلق ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص Giology کا ماہر ہے تو اس کو قرآن کریم کی ان آیات کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہئے جس میں زمین کی

پیدائش' اس کا دوادوار میں پیدا ہونا' اور زمین کے متعلق ہی مختلف معلومات فراہم ہوتی ہوں۔ ایک Geologist' ان آیات میں غور وفکر کرنے کے بعد ان گہرے نتائج پر پہنچ سکتا ہے' جن پر ایک عام آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح قرآن کریم میں سائیکولوجی کے متعلق بہت کافی تعداد میں آیات ہیں' ایک ماہر نفسیات ان کے مفاہیم کو آسانی سمجھ سکتا ہے۔ ہم ان کی تہہ کو نہیں پہنچ سکتے' ملائکہ کائنات کی قوتیں ہیں' ان پر ایک ماہر طبیعات ہی Research کر سکتا ہے۔ اور نہایت اعلیٰ معلومات ان آیات سے Physics کے متعلق حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو ان کے وحی الٰہی ہونے کے دلائل فراہم ہوتے ہیں کہ قرآن کریم کس طرح مختلف علوم کا حامل ہے اور جو کچھ قرآن نے اس وقت کہا تھا' آج چودہ سو سال بعد بھی موجودہ علوم اس کی تائید کر رہے ہیں اور دوسری طرف آیات کی صحیح تفسیر بھی ہو جاتی ہے۔ ہماری سابقہ تفاسیر میں اس طرح کا مواد موجود نہیں ہے۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ہمارے مفسرین نے قرآن کریم کی تفاسیر نہایت اخلاص' محنت اور عرق ریزی سے تحریر فرمائی ہیں۔ لیکن اس دور کی علمی سطح اتنی بلند نہیں تھی کہ اس دور کی تحریر کردہ تفاسیر' آج کے ذہن کو مطمئن کر سکیں۔

قرآن کریم اور کائنات میں مطابقت کی ایک اور مثال بھی قابل غور ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی چیزوں اور قدرت کی تخلیق کردہ چیزوں میں اس درجہ نمایاں فرق ہوتا ہے کہ ہر شخص ننگی آنکھ سے اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ کون سی چیز انسان کی بنائی ہوئی ہے اور کون سی قدرت کی تخلیق کردہ۔ پہاڑ' گھاس' میوہ جات' پھل اور دوسری بے شمار اشیاء کے متعلق ایک نگاہ میں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قدرت کی پیدا کردہ ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کی آیات کو کسی اچھے سے اچھے کلام میں مزین کر دیں ایک نگاہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے۔ احادیث کی مستند ترین کتب' صحاح کی احادیث کے درمیان میں جب بھی چھوٹی سے چھوٹی آیت آجاتی ہے تو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قرآنی آیات ہے۔ اسی طرح جو بڑے سے بڑے انجینئر سو سو منزلہ عمارتیں تعمیر کر سکتے ہیں وہ ایک پتہ گھاس کا نہیں بنا سکتے۔ بعینہٖ اسی طرح دنیا کا بڑے سے بڑا مصنف' جس نے ضخیم سے ضخیم کتب تحریر کی ہوں وہ قرآن کریم کی ایک آیت نہیں بنا سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے قول وفعل کی مطابقت کی بہترین مثال ہے۔

قرآن فہمی کے لئے خود قرآن نے ''تدبر قرآن'' کا ذکر بار بار کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے افلا یتدبرون القران ام علی قلوب اقفالھا (47/24)۔ کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے کیا دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں' اس آیت کریمہ میں قابل غور بات یہ ہے جو عموماً ہمارے ہاں تراجم یا تفاسیر میں نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ یہاں ھا کی ضمیر لا کر' اس مفہوم کا اضافہ کیا گیا ہے کہ کیا ان کے دلوں پر ان کے اپنے ہی دلوں کے تالے پڑ گئے ہیں۔ ایک ھا کی ضمیر نے مفہوم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ سلسلہ کلام یہ ہے کہ ہم سب کو

قرآن کریم پر غور کرنا چاہئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھما خود قرآن کریم پر رات دن غور فرماتے تھے۔ وہ قرآن کا اتنا حصہ ہی پڑھتے تھے جس کو وہ سمجھ لیتے تھے۔ ارشاد حضرت باری تعالیٰ بھی یہی ہے کہ فاقرء وا ما تیسر من القران (73/20)۔ ''قرآن میں سے اتنا پڑھو جس کا مفہوم تمہارے لئے آسان ہو گیا ہو۔'' صحابہ کرامؓ جو قرآن کریم کی روشن قندیلیں تھیں وہ قرآن کو تدبر کے ساتھ ہی پڑھا کرتے تھے۔ ان میں بھی ان حضرات کا مرتبہ زیادہ بلند تھا جنہوں نے زیادہ محنت کر کے' قرآن کو زیادہ سمجھا تھا۔ وہ قرآن فہمی کے لئے حلقے بناتے تھے جو آج کی اصطلاح میں ایک طرح کے Study Circles تھے اور قرآن کے مطالعے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ حضورﷺ بھی ان کو Encourage کرتے تھے۔ آپ فکر کرنے والوں کو ذکر کرنے والوں پر ترجیح و فوقیت دیتے تھے۔ حضورﷺ کے بعد حضرت عمرؓ نے خصوصاً ان حلقوں میں زیادہ گہری دلچسپی لی۔ تفسیر بالروایات یعنی قرآن کریم کی تفسیر کو روایات کے ذریعہ کرنے سے قرآن میں غور و خوض کرنے کا شوق و جذبہ باقی نہیں رہتا۔ جو روایات میں آیا اس پر اکتفاء کیا۔ اس طریقہ پر سب سے بڑا عالم اور بہترین مفسر وہ ہے جس کو سب سے زیادہ احادیث یاد ہوں اور جو ہر آیۂ کریمہ کی تشریح میں زیادہ سے زیادہ احادیث کا احاطہ کر سکے اور احادیث کا Cataloguer یا شاہ ولی اللہ صاحب کے بقول وراق ہو۔

قرآن کریم نے خود اپنے لئے فرمایا کہ وہ تبیاناً لکل شی ہے (16/89)۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کذلک یبین اللہ آیتہ للناس لعلھم یتقون (2/187)۔ یوں کھلم کھلا خدا اپنے احکام لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے تاکہ وہ متقی ہوں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے کو بیان للناس قرار دیتا ہے۔ مزید یہ کہ اس میں درست اور غلط چیزیں بالکل واضح ہو گئی ہیں۔ قد تبین الرشد من الغبی (2/256)۔ یہ کتاب مبین ہے (5/15)' یہ آیت کریمہ تو حجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے الذین یکتمون ما انزلنا من البینات و الھدیٰ من بعد ما بینہ للنس فی الکتاب اولئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللعنون (2/159)۔ بے شک جو لوگ (ہماری) ان روشن دلیلوں اور ہدایتوں کو جنہیں ہم نے اتارا ہے اس کے بعد چھپاتے ہیں جب کہ ہم کتاب میں لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کر چکے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں یہ آیۂ کریمہ اس بات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ ما بینہ للناس فی الکتاب کے الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر و تشریح خود باری تعالیٰ عزاسمہ نے کر دی ہے اور فی الکتب کے لفظ سے یہ واضح ہے کہ وہ تشریح کتاب میں ہی ہے کتاب سے باہر احادیث میں نہیں ہے۔ اس مفہوم پر اس سے زیادہ واضح' صاف اور کون سے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں جو یہ مفہوم و مضمون ادا کر سکیں۔ اس آیت کریمہ کے بعد کتاب

کی توضیح کتاب کے اندر ہونے سے بظاہر انکار کی قطعاً کوئی راہ نہیں رہتی۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ اپنی کتاب کی تبیئن خود ہم نے کتاب کے اندر کر دی ہے تو پھر کتاب سے باہر مزید کسی تبیئن کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تبیئن کے بعد مزید تبئن کے کیا معنے؟

ہمارے ہاں گزشتہ چودہ سو سال سے تفسیر کرنے کا یہی ایک طریقہ تفسیر القرآن بالروایات چلا آ رہا ہے۔ اس مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ سابقہ طریقہ درست نہیں تھا۔ اس سے ایک ایک آیت کا مفہوم تو سامنے آ جاتا ہے' لیکن قرآن کریم کی مجموعی تعلیم سامنے نہیں آتی۔ اس طول طویل عرصہ میں سینکڑوں تفاسیر تحریر کی گئیں مگر طریقہ سب کا ایک ہی تھا۔ مختلف فرقوں نے تفاسیر لکھیں' لیکن سب فرقوں نے اسی انداز کو اختیار کیا۔ البتہ گزشتہ صدی سے یہاں برصغیر ہندو پاک میں چند نامور مفکرین نے تفسیر القرآن بالقرآن کا سلسلہ جاری کیا ہے اس طریقہ سے تفسیر تحریر کرنے میں یہ بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ چونکہ آیات کی تفسیر خود آیات سے کی جاتی ہے' اس لئے خارج کے نظریات اس تفسیر میں سرایت نہیں کرتے اور خالص قرآنی تعلیم سامنے آ جاتی ہے اور غیر قرآنی نظریات کٹ کے الگ ہو جاتے ہیں۔

راقم سطور کمترین' اگرچہ فارغ درسِ نظامی ہے' تاہم اس کو زمرۂ علماء میں شمار ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے۔ اسی لئے راقم کمترین حد درجہ کسی کی تحریر پر انتقاد کرنے سے گریز کرتا ہے۔ تاہم یہ مختصر مضمون نہایت دل سوزی' درد مندی اور اخلاص سے اسی لئے تحریر کیا گیا ہے کہ حضرت مولانا ابو عمار زاہد الراشدی صاحب اس مضمون کو اپنے مطالعہ عالی سے نوازیں۔ قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناطے یہ کمترین اپنا فرض سمجھتا تھا کہ حق بات کا اظہار کر دے' اس کے علاوہ اس خطا کے ارتکاب کا اور کوئی سبب (Motive) نہیں ہے۔

جوابِ خواجہ نظری نوشتہ ام غالب
خطا نمودہ ام و چشمِ آفرین دارم

سانحہ ارتحال

تحریک طلوع اسلام کے قدیمی کارکن اور بزم طلوع اسلام سیالکوٹ کے سابق نمائندہ محترم محمد حسین گھمن صاحب طویل علالت کے بعد گھوئینکی' سیالکوٹ میں وفات پا گئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے۔ ادارہ ان کے اعزہ واقارب کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

نمائندہ بزم سیالکوٹ کا مکتوبِ گرامی

تحریک طلوع اسلام ایک مسلسل جدوجہد کرنے والے ساتھی محمد حسین گھمن صاحب سے محروم ہوگئی۔ میری ان سے ملاقات 1990ء میں ہوئی میں نے ان کو ہمیشہ قرآنی تعلیمات کو آگے بڑھانے کے لئے کوشاں پایا۔ جب 2001ء میں سیالکوٹ میں دوبارہ بزم قائم ہوئی تو میں ان کو ملنے کے لئے گھوئینکی گیا۔ اس وقت بہت ضعیف ہو چکے تھے' قوت سماعت بھی کمزور ہوگئی تھی لیکن ان کا جذبہ جواں تھا۔ میرے ساتھ جواں سال ساتھی محمد طاہر بٹ صاحب بھی تھے۔ سیالکوٹ میں بزم کے قیام سے بہت خوش ہوئے اور اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے' ہمیں دونوں کو باری باری گلے لگاتے رہے۔ جب ہم ان سے جدا ہوئے تو ہمارے پیچھے دور تک ان کی دعاؤں کی آواز آتی رہی۔ بزم سیالکوٹ کے اراکین فرداً فرداً ان کی خیریت دریافت کرتے رہتے تھے۔ ان کی وفات سے کچھ دن قبل بھی میری ان سے ملاقات ہوئی۔ محمد طاہر بٹ بھی میرے ہمراہ تھے۔ انہوں نے ہمیں کچھ نصیحتیں کیں جن کو ہم نے ریکارڈ کرلیا۔ تحریک طلوع اسلام اور خاص کر بزم سیالکوٹ اپنے بہت بڑے محسن سے محروم ہوگئی ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

سونامی فنڈ

ادارہ طلوع اسلام کے تحت قائم کردہ سونامی فنڈ کے لئے محترم جمیل بشیر صاحب' کراچی نے بزم طلوع اسلام کراچی' صدر کی معرفت مبلغ 1800 روپے ارسال کئے ہیں جس کے لئے ادارہ تہہ دل سے ان کا شکر گزار ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک علمی مکالمہ

پروفیسر میاں انعام الرحمٰن

قربانی کی رسم کا نفسیاتی پہلو

قربانی کا تصور شاید اتنا ہی قدیم ہے جتنی انسان کی معلوم تاریخ۔ تاریخ کے ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں قربانی کی رسم موجود رہی ہے۔ یہ رسم اپنے ظاہر میں متنوع ہونے کے باوجود کسی ایسے یکساں جذبے یا داخلی تحریک کی علامت ہے جو تمام انسانوں میں فطری طور پر موجود ہے۔ تاریخ کے صدیوں پر محیط سفر سے ان گنت مثالیں دینے کے بجائے ہم صرف اسی مثال پر اکتفا کریں گے کہ اہل روم دوسری پیونک جنگ تک دیوتاؤں کے حضور انسانوں کی قربانی پیش کیا کرتے تھے۔ قربانی کے اس سفاک مظہر کو معاشرے میں عمومی قبولیت حاصل تھی کیونکہ اس کے ذریعے سے لوگوں کے ایک فطری داخلی جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔ یہاں ہم تحلیل نفسی کی اس بنیادی دریافت کا ذکر کرنا مناسب سمجھیں گے جس کے مطابق' اگر کسی داخلی تحریک یا جذبے کو عمل میں ظاہری اظہار پانے سے روک دیا جائے تو وہ جذبہ عموماً ختم نہیں ہوتا' بلکہ ہوتا یہ ہے کہ وہ وقتی طور پر ''دب'' جاتا ہے اور پھر بعد میں اظہار کی ایسی راہ تلاش کرتا ہے جو اکثر اوقات اس ظاہری اظہار سے بہت زیادہ قبیح اور نقصان دہ ہوتی ہے جسے نامعقول قرار دے کر (یا کسی بھی وجہ سے) عمل میں آنے کا موقع نہیں دیا جاتا اور اسے دبانے کی بھی (بظاہر کامیاب) کوشش کی گئی ہوتی ہے۔

ہماری رائے میں سنتِ ابراہیمؑ کی بے شمار حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ یہ انسان کی بہت بڑی نفسیاتی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اگرچہ زندہ صحت مند جانور کے گلے پر چھری پھیرنا' خون بہانا' کھال اتارنا وغیرہ کسی حد تک سفاک عمل معلوم ہوتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں یہی داخلی جذبہ جس کی تسکین جانور کو ذبح کرنے سے ہو جاتی ہے' کسی بہت ہی مکروہ اور انسانیت سوز صورت میں سامنے آ سکتا ہے' جیسا کہ خود انسان کی قربانی کرنا۔ مسلم معاشرے کی تقریباً ہزار سالہ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں انسانیت سوز قسم کی رسوم کبھی نہیں پنپ سکیں' اس کی ایک بنیادی وجہ اسلام کا تصورِ قربانی ہے۔ اسلام کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے بنیادی جذبات اور داخلی

تحاریک کی نفی نہیں کرتا' بلکہ ان کی تہذیب کرتا ہے جیسا کہ جنگ کے مقابل جہاد کا تصور۔ جہاد' انسان کے ایک فطری جذبے کی متشکل جہت اور جنگ کی تہذیب یافتہ صورت ہے۔ یہ کہنا بہت آسان ہوگا کہ جنگ ہونی ہی نہیں چاہئے اور اسی طرح قربانی بھی نہ ہوتو بہتر ہے کہ اس میں خوامخواہ خون بہایا جاتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ کہنا ہی آسان ہے لیکن اس پر عمل عمومی انسانی نفسیات اور رویے کے باعث ناممکن ہے۔ مثلاً اگر سبزی خور قوموں کی رسوم پر نظر دوڑائی جائے تو ایک طرف جانوروں کی پرستش نظر آئے گی اور دوسری طرف عورت کا خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جل مرنا۔ ان دو مظاہر کے تضاد سے وہ قومیں آگاہ ہی نہیں ہوتیں کیونکہ دونوں مظاہر انسان کے دو داخلی فطری جذبات کی نمائندگی کررہے ہوتے ہیں۔

ہماری رائے میں ستی اور اسی نوعیت کی دیگر رسوم اس جذباتی خلل کا نتیجہ ہیں جو ایک فطری جذبے (قربانی) کے مناسب اظہار پر پابندی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ اسلام اپنی اپروچ میں ''خیالی اور مثالی'' تعلیمات نہیں دیتا بلکہ اس کی مثالی تعلیمات کی نوعیت ''ممکن الحصول مثالی'' کے دائرے میں آتی ہے' اسی لئے اس نے انسانی روح میں گندھے ہوئے جذبات کے اظہار پر پابندیاں عائد کرنے کے بجائے ان کے اظہار کی ایسی راہیں نہ صرف تسلیم کی ہیں بلکہ انہیں اپنانے کی ترغیب بھی دی ہے جو داخلی جذبات کی آسودگی کے ساتھ ساتھ انسان کو بطور انسان متوازن رکھتی ہیں۔ دنیا کی قومیں اگر اپنی تاریخ کے آنے والے دور میں ''قبیح رسوم'' سے بچنا چاہتی ہیں تو عید الاضحی میں مضمر مذکورہ بالا حکمت کے پیش نظر انہیں مسلمانوں کی ہمراہی میں سنتِ ابراہیمیؑ ادا کرنی چاہئے۔

☆☆☆

(2)

آفتاب عروج' چنیوٹ

ماہنامہ 'الشریعہ' جنوری 2005ء کے شمارہ صفحہ 30 پر محترم پروفیسر میاں انعام الرحمٰن صاحب کا مضمون 'قربانی کی رسم کا نفسیاتی پہلو' پڑھنے کے بعد یہ طالب علم سوچ میں پڑ گیا کہ محترم پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون کا جو سرعنوان دیا ہے' اس میں قربانی کو ایک رسم اور نفسیاتی عمل کہا گیا ہے' جبکہ عام مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق قربانی کو فرض' واجب کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ میری ناقص عقل کے مطابق جس چیز یا عمل کو شریعت نے فرض یا واجب قرار دے دیا ہو' اسے رسم و رواج کے زمرہ میں شمار نہیں کیا جانا چاہئے' بلکہ اس پر عمل پیرا ہونا لازمی امر بن جاتا ہے۔ جبکہ رسم کوئی بھی ہو' اس پر عمل پیرا ہونے یا نہ ہونے سے فرد کے عقیدے اور اس کی ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس طالب علم کی رائے کے مطابق پروفیسر صاحب کو سب سے پہلے قربانی کی تعریف (Definition) کرنی چاہئے تھی کہ قربانی ہے کیا؟ قربانی کیوں کی جاتی ہے؟ قربانی صرف جانور کی ہی ہوسکتی ہے یا کسی اور چیز کی بھی قربانی ہوسکتی ہے؟ نیز یہ کہ قربانی کرنے یا نہ کرنے سے فرد کی ذات اور اس کے کردار پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اور اس سے سوسائٹی یا معاشرہ

میں کیا تبدیلی رونما ہوسکتی ہے؟ تاکہ مضمون پڑھتے وقت قاری کا ذہن تذبذب یا التباس میں نہ پڑ جائے۔

بے شک انسانی تاریخ میں قربانی کا تصور موجود رہا ہے' گوکہ اس کی نوعیت مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے اور دیوی' دیوتاؤں کے حضور انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں دی جاتی رہی ہیں بلکہ وحشت کے دور میں تو ایک انسان دوسرے انسان کی خوراک بھی بن جایا کرتا تھا' لیکن یہ جانی قربانی کسی بھی دور میں انسان کے کسی بھی فطری جذبہ کی تسکین کی خاطر نہیں کی جاتی تھی' جیسا کہ پروفیسر صاحب نے تحریر فرمایا ہے' بلکہ یہ قربانی خارج میں فطرت کی قوتوں کے ڈر اور خوف کے جبر کا نتیجہ تھی اور اس ڈر اور خوف کی مجبوری کا اثر انسان کے خیالات اور جذبات پر بھی پڑتا تھا۔ اُس وقت اس کے خیال کے مطابق انسانی یا حیوانی قربانی دینے سے وہ محفوظ و مامون رہ سکتا تھا اور اس ڈر اور خوف سے اسے نجات مل جائے گی۔ وہ جاہلیت کا دور تھا۔ جوں جوں انسانی شعور کا ارتقا اور اس کی نشوونما ہوتی چلی گئی' انسان نے فطرت کی قوتوں کو ایک ایک کر کے مسخر کرنا شروع کر دیا تو جانی قربانی کا تصور کمزور ہوتا چلا گیا۔ اب تمام دنیا میں (ماسوائے مسلم معاشرہ کے) ہر قسم کی جانی قربانی کا تصور تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ ایک ماہر نفسیات بتا رہے تھے کہ جب سے انسان وجود میں آیا ہے' ہنوز یہ اپنی شعوری صلاحیتوں کا صرف دس فی صد حصہ اپنے تصرف میں لا سکا ہے اور ابھی نوے فیصد شعوری صلاحیتیں اسٹور میں پڑی ہیں۔ جیسے جیسے انسانی شعور بلند ہوتا چلا جائے گا' فرسودہ تصورات و روایات از خود ختم ہوتے چلے جائیں گے۔

فطرت (Nature)' فطری جذبہ سے مراد کسی شے کی وہ خصوصیت ہے جو اٹل ہو۔ کوئی بھی شے اپنی فطرت کو بدل نہیں سکتی۔ شیر کی فطرت درندگی' بکری کی فطرت چرندگی' یہ فطری تقاضے ہیں۔ ان کے اظہار پر سب جاندار بشمول انسان مجبور ہیں۔ کیا جانی قربانی کا عمل بھی انہی معنوں میں لیا جا سکتا ہے؟

اب رہی داخلی جذبات کی بات تو عرض ہے کہ علم النفس کی رو سے جذبات مجموعہ ہوتے ہیں ان خارجی ابتدائی نقوش کا جو وراثت' ماحول اور ابتدائی تعلیم سے بچے کے ذہن پر مرتسم ہوتے رہتے ہیں یا یہ حاصل ہوتے ہیں ان تصورات' معتقدات' رسوم و رواج کا جو تمام انسانوں کو نسلی طور پر وراثتاً ملتے ہیں' لہٰذا جانی قربانی کو کسی یکساں جذبے یا داخلی تحریک کی علامت کے طور پر تمام انسانوں میں فطری طور پر موجود قرار نہیں دیا جا سکتا' کیونکہ جذبات ہر انسان کے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں' یکساں ہو ہی نہیں سکتے۔

اب رہیں نفسیاتی اور تحلیل نفسی کے حوالے سے میری معروضات۔ ہر فرد کی نفسیاتی کیفیت الگ الگ ہوتی ہے۔ اسی طرح مختلف اقوام اور قبائل کی نفسیات بھی مختلف ہوتی ہیں۔ نفسیاتی تبدیلی کیسے رونما ہوتی ہے' میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ دو ایک مزید مثالیں لیجئے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ انگریزی خواتین اپنے جسم' ہاتھ اور منہ کا ننگا رکھنا معیوب اور گناہ سمجھتی تھیں۔ یہ ان کی اس وقت کی نفسیات تھی۔ آج اسی انگریزی معاشرہ کی خواتین لباس کے تکلف

سے بھی آزاد ہو چکی ہیں۔ یہ اس وقت کی نفسیات ہے۔ ہندو کو گوشت کے نام سے ہی گھن آتی ہے' جبکہ مسلمان کی خوراک میں گوشت لازمی جزو کے طور پر شامل ہے۔ مسلمان کو سور کے نام سے گھن آتی ہے' تو عیسائی اسے شوق سے کھاتے ہیں۔

ہندو قوم میں ستی کی رسم کو آپ نے داخلی جذبات کی گھٹن کا نتیجہ قرار دیا۔ اس عاجز نے جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے' وہ یہ کہ ستی کی رسم غیرت کے نام پر قتل قسم کی چیز تھی۔ شوہر کے مرجانے پر قتل ہونے کے بعد بیوہ عورت کسی دوسرے مرد کی بیوی بننا گوارا نہیں کرتی تھی اور شوہر کے ساتھ جل مرنے کو ترجیح دیتی تھی۔ بعد میں اس عمل کو مذہبی تقدس بھی حاصل ہو گیا تھا۔ یہ سلسلہ انگریزوں نے آ کر بند کیا۔ تو عرض ہے کہ اس رسم کو تحلیل نفسی (کی رُو سے) داخلی جذبات کی گھٹن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ..... یہ صرف اعتقاد اور عقیدہ کا مسئلہ ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ الشریعہ' اپریل 2005ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Voice of Youth

سبینہ اویس اعوان

اقبال کا مردِ مومن

اقبال کا ایک مشہور شعر زبان زد خاص و عام ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ دیدہ ور کون ہے؟

دیدہ ور کی تلاش ہر دور کے انسان کو ہوتی ہے یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ موجود سے غیر مطمئن اور غیر موجود کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

فلسفیوں، شاعروں، مفکروں، ادیبوں کے ہاں مثالی انسان کی تلاش ہمیشہ سے رہی ہے۔ ہومر کے ہاں ''مرد آزاد'' اور فیثا غورث کے ہاں بھی یہی تصور ملتا ہے۔ نطشے کے ہاں ''فوق البشر'' اور ہیگل کے ہاں تاریخی انسان کا، تصور ملتا ہے۔ اسی طرح مشرقی ادب میں عبدالکریم جیلی اور مولانا روم کے ہاں بھی ایک ایسے ہی انسان کی تلاش نظر آتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ قرآن مجید میں مرد کامل کا تصور ملتا ہے جو اشرف المخلوقات کہلانے کا صحیح مستحق ہے۔

اقبال نے جس مرد کامل کا تصور پیش کیا ہے وہ قرآن کریم سے ماخوذ ہے۔ جو کہ تخلیق کائنات کا مقصود حقیقی اور انسان کامل ہے۔ اقبال اس انسان کو مرد خدا۔ مرد قلندر۔ مرد بزرگ۔ بندہ آفاقی۔ نائب حق۔ مومن۔ جانباز مسلماں۔ مرد مسلماں۔ درویش اور فقیر کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔

اقبال کے ہاں یہ مثالی پیکر موجود ہے۔ فکر اقبال کا ہر موضوع اگر دیکھا جائے تو اس میں سب سے اہم پہلو اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے جس پر انہوں نے بہت سی نظمیں لکھیں جیسے مرد مسلماں، مومن، مردان خدا، کافر و مومن، قلندر کی پہچان، طارق کی دعا وغیرہ وغیرہ ان نظموں کے علاوہ بیسیوں مقامات پر اس سے متعلق اشعار ہیں جو مرد مومن کے اوصاف کردار اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تصور کی ضرورت کیوں پیش آئی کیوں کہ اقبال کی شاعری اور ان کے افکار پر قرآن حکیم کی گہری چھاپ موجود ہے اور خود اقبال نے کہا

ہے کہ میں درحقیقت قرآن اور اسلامی احکام کی ترجمانی کرتا ہوں اور چوں کہ وہ قرآن پاک کی ترجمانی کرتے تھے اس لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اس انسان کی ترجمانی بھی کرتے جو قرآن پاک کا مردکامل ہے۔

دوسری بات یہ کہ اقبال کے زمانے میں پورے عالم اسلام پر ایک جمود طاری تھا۔ بیشتر علاقے زیرتسلط تھے اس صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہوں نے یہ مثالی انسان کا تصور دیا کہ انسان ایسا ہونا چاہئے۔

تیسری بات یہ کہ اقبال کے تصور خودی کا تقاضا تھا کہ کوئی سراپا اس کا مظہر بھی ہو جو اس خودی کا تربیت یافتہ ہو۔ اقبال نے تربیت خودی کے جو تین مراحل اطاعت الٰہی' ضبط نفس' نیابت الٰہی بتائے ہیں وہ دراصل اسی ارتقائے خودی کا مظہر ہے۔ اقبال کا مردمومن دراصل قرآنی نظریے کا حامل انسان کامل ہے۔

سید آصف جاہ جعفری رقمطراز ہیں:

اقبال کی بہت سی توقعات اپنے مردمومن اور اس کی خودی سے قائم ہیں۔ اقبال کی محبتیں بھی اسی مرد مومن کے لئے ہیں۔ مردمومن اقبال کے پورے مفکرانہ مضامین میں ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ جس کے لئے اقبال نئے نئے راستے تلاش بھی کرتے ہیں اور اس کو نئے سورج کے ٹھکانوں سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔[1]

وسیع انسانی تاریخ پر اس کی غائر نظر ہے۔ اس لئے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہے کہ یہ کائنات اور اس کے سارے لوازمات صرف ایک سچے مسلمان کے لئے وجود میں آئے ہیں وہ اس کائنات کے تمام خزانوں اور ساری چیزوں کا وارث ہے۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

اقبال کے نزدیک حالات ومصائب اور حوادث کے سامنے سر جھکا دینا اور قضا وقدر کا عذر پیش کرنا ایک مرد مومن کا کام نہیں۔ اس قسم کا عذر تو وہ لوگ پیش کرتے ہیں جو ضعیف الایمان اور کمزور عزم و ارادہ کے مالک ہیں' مرد مومن خود تقدیر الٰہی ہے۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

اقبال کو اس بات پر یقین تھا کہ ایک ''مسلم ربانی'' کا کوئی محدود وطن نہیں ہے بلکہ سارا عالم اس کا ملک و وطن ہے اس کے مشرق ومغرب کی کوئی تقسیم نہیں۔

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اس کا نہ دِلی نہ صفاھاں نہ سمرقند
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

ایک مسلمان اپنے دین کا ہو بہو نمونہ اور اسلام کی سچی تصویر اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ ان تمام اخلاق وصفات کا اپنے آپ کو پرتو نہ بنالے۔

1۔ سید آصف جاہ جعفری ''مفکر پاکستان علامہ اقبال'' ملتان سوہنی دھرتی پبلشرز آف پاکستان' طبع اول 1987' صفحہ نمبر 140۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

اقبال کہتے ہیں کہ ایسے ہی مردمومن کی مثال اس روشن آفتاب کی سی ہے۔ جس کے لئے غروب نہیں جو ہمیشہ طلوع ہی رہتا ہے اگر ایک طرف غروب ہوا تو دوسری جانب طلوع ہوا۔

جہاں میں اہل ایمان صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

ڈاکٹر سید عبداللہ ''مسائل اقبال'' میں لکھتے ہیں:

''اقبال نے اپنے زمانے تک کے سب تصورات کے ادھورے پن کا احساس کرتے ہوئے ہمیں ایک نئے آدم یا نئے انسان کا تصور دیا جو مغربی معاشرے کی ابتری کا علاج بھی کرسکتا ہے اور اپنی آرزوؤں کی بھی ایک دنیائے نو تعمیر کرسکتا ہے''۔ 1

اقبال کی طبیعتِ حساس کو جب مسلمانوں کی موجودہ ابتر زندگی کا احساس ہوتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتا ہے اور خون کے آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو جاتے ہیں اور وہ توحید اسلامی کے اس وارث سے شکوہ سنج ہوتا ہے۔

اے لا الہ کے وارث' باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتارِ دلبرانہ' کردارِ قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل' سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا' جذبِ قلندرانہ

اقبال کے نزدیک دنیا میں موجود تمام خرابیوں کا باعث مومن کا وہ قلب ہے جو ایمان سے خالی ہو چکا ہے اور جس کی زندگی کے شعلے بجھ چکے ہیں کہتا ہے۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج' دل پریشاں' سجدے بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

مایوسیوں کے ظلمت کدے میں اقبال کی آواز ایک بانگ درا ثابت ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کو ان کی عظمت کا احساس دلانے کے لئے مردمومن کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
مکاں فانی مکیں فانی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

اقبال کا مردمومن کوئی تصوراتی ہیولا نہیں ہے۔

اقبال کی نگاہوں کے سامنے مسلمانوں کی موجودہ حالت و کیفیت عیاں ہے اور وہ اس حالت زار پر بے چین و پریشان اور شکوہ سنج بھی ہے لیکن چونکہ اقبال یاس و قنوط کا شاعر نہیں بلکہ امید اور آس' یقین و ایمان کا پیغامبر ہے۔ اس لئے وہ مایوس نہیں ہے اسے اس بات پر یقین ہے کہ عالم اسلام کو جو سیاسی تھپیڑے لگے ہیں اس نے مسلمانوں کو بیدار کر دیا ہے اور ان میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے۔ اس

1۔ سید عبداللہ ڈاکٹر ''مسائل اقبال'' مغربی پاکستان اردو اکیڈیمی لاہور' اشاعت دوم 1987ء' صفحہ نمبر 271۔

لئے کہتے ہیں۔ ؎

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے گوہر کی ہے سیرابی

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں۔ ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اقبال کی دوررس نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ مغربی تہذیب کی زندگی کے دن اب پورے ہو چکے ہیں۔ ایک ''جہانِ نو'' پیدا ہو رہا ہے۔ لیکن جب تک اس جہان نو کی امامت و قیادت ''مردمومن'' کے ہاتھوں میں نہیں آتی اس وقت تک یہ انسانیت فرنگی مقامروں کے ہاتھوں ہلاکت و بربادی سے دوچار ہوتی ہی رہے گی۔ ضرورت ہے کہ ''مرد مومن'' اٹھے اور ایک ''جہان نو'' کے بانی کی حیثیت سے موجودہ بیمار انسانیت کے دکھوں کا مداوا بن کر اسے ایک نئی زندگی اور توانائی عطا کرے۔ ؎

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمارخانہ

اقبال سمجھتے ہیں کہ اقوام عالم کی حکمرانی مردمومن کا مقدر ہے۔ عالمگیر حکمرانی کا یہ تاج ماضی میں بھی مردمومن کا اعزاز تھا اور آج بھی یہ اعزاز مردمومن کو آواز دے رہا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ مسلماں مردمومن کے سانچے میں ڈھل جائے۔

انسانِ کامل کے اندر وہ قوت موجود ہے جس کی رو سے وہ نہ صرف کائنات کو اپنے اندر جذب کرتا ہے بلکہ خود خدا کو بھی اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ مردمومن کی ہمہ گیر فطرت کے متعلق اقبال نے ''مردمسلماں'' کے عنوان سے ''ضربِ کلیم'' میں ایک پرزور نظم لکھی ہے۔ ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برھان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

مردمومن کا ارادہ پہاڑ کی طرح مضبوط ہوتا ہے اور وہ خطرات میں گھرے رہنے ہی کو اصل زندگی سمجھتا ہے کیوں کہ خطر پسند زندگی صرف مجاہد کو ہی محبوب ہوتی ہے۔

اقبال کا مردمومن خودی سے سرفراز ہوتا ہے' اللہ کی ذات پر مکمل ایمان کی بدولت عزم و استقلال اور ناقابل شکست جرات و ہمت کا حامل ہوتا ہے اور راہ حق میں بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے وہ ایک چٹان بن جاتا ہے۔ ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جذبہ عشق مردمومن کے لئے لازم و ملزوم حیثیت رکھتا ہے اسی سے یہ آداب بے خوفی بھی سیکھتا ہے اور اسی جذبے کے باوصف وہ آتش نمرود میں بھی کود پڑتا ہے۔ اس کی تمام سرگرمیاں اس جذبہ عشق ہی کی بدولت ہیں: ؎

مردِ خدا کا عمل' عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات' موت ہے اس پر حرام

اقبال کے مردمومن میں انکساری اور استغنا بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ وہ نطشے کے فوق البشر کی طرح متکبر نہیں

ہوتا بلکہ خوددار، غیرت مند ہوتا ہے۔

اقبال کا مردِ مومن زندہ جاوید ہے اس لئے کہ وہ اپنے پاس زندہ جاوید پیام (قرآنِ کریم) رکھتا ہے۔ اس کی زندگی ایک زندہ جاوید مقصد کے لئے گزرتی ہے۔ ؎

مٹ نہیں سکتا کبھی، مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش، سرِ کلیم و خلیل

انسان کامل اپنے اعجازِ عمل سے تجدید حیات کرتا ہے۔ وہ پرانی اصطلاحوں کو نئے معنی پہناتا ہے۔ وہ تاریخ کی تخلیقی رو کو اپنے حسبِ منشاء موڑ دیتا ہے۔ اقبال نے اس کی ذات سے ایجاد و تسخیر کی بڑی امیدیں وابستہ کی ہیں۔ اس انسان کامل کے جلوے کے لئے ستاروں کی آنکھیں صدیوں وقف انتظار رہتی ہیں۔ تب کہیں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ ؎

تو کیستی ز کجائی کہ آسمانِ کبود
ہزار دیدہ براہِ تو از ستارہ کشود

اور کبھی عروجِ آدم کی بلندیوں کو دیکھ کر بزمِ انجم میں سراسیمگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

نرگس ہزاروں سال اپنی بے نوری پر ماتم کناں رہتی ہے تب کہیں چمن میں صاحبِ نظر کی پیدائش ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی اقبال کا مردِ مومن اپنی مخصوص شخصیت، منفرد کردار اور نئی آن بان رکھتا ہے اور وہ ہر اعتبار سے دوسروں کے پیش کردہ انسان کامل سے زیادہ متوازن، زیادہ جاندار اور قابلِ عمل کردار ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیہات کی بات/ باغبانی

محترم جمیل الدین عالی جنگ 4 اپریل 2005ء مستقبلی (Futuring) میں لکھتے ہیں:

''ہماری ستر فیصد آبادی جو دیہات میں رہتی ہے۔ وہ بہرحال اپنے بہت سے معاملات اپنی پنچایت میں لے آتی ہے۔ ہفتے میں ایک نشست مستقبل کے بارے میں تبادلہ خیال کے لئے بھی وقف کرسکتی ہے اگر ممکن ہو سکے تو وہ ایک بے تنخواہ رضا کار کا انتخاب کرلے جو اس تبادلہ خیال کا نچوڑ لکھ لیا کرے۔ پھر اس کی ایک نقل ضلع مرکز کو بھی بھیج دے جو ایسی رپورٹوں پر مشتمل ہر مہینے نہیں تو ہر تین مہینے میں ایک مختصر سا جریدہ شائع کر کے ممکنہ حد تک چار اطراف اور مقامی اور اپنے صوبائی صدر مقامات کے اخبارات کو بھیج دیا کرے۔ مجھے قوی امید ہے کہ وہ ان کے اختصاریئے ضرور شائع کر دیا کریں گے۔

یہی عمل تحصیلی اور ضلعی سطح پر بھی دہرایا جا سکتا ہے۔ سینکڑوں کالج ہیں۔ پھر کالج میں ایک مختصر سی غیر سیاسی فیوچر سوسائٹی قائم ہوسکتی ہے جس میں مختلف مضامین کے طلباء طالبات اور اساتذہ مقررہ وقفوں سے جمع ہو کر قومی مستقبل پر تبادلہ خیال کر سکتے ہیں۔ اسے ٹیپ کر کے خلاصوں میں ڈھالا جا سکتا ہے جو مقامی اور صدر مقامی اخبارات جرائد کو بھی بھیجے جا سکتے ہیں اور کالج کے اپنے جرائد میں بھی آ سکتے ہیں۔ (یہ جرائد کالجس ے باہر قارئین مثلاً والدین اور سرپرست ضرور پڑھتے ہیں اور یہ کیوں ممکن نہیں کہ ہر یونیورسٹی میں ایک فیوچر سوسائٹی قائم ہو جائے وہاں تو مختلف موضوعات ومضامین کے ماہرین بھی ایک معقول تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔ شوقین طلبا وطالبات کی ایک تعداد بھی آ جائے گی وہ اس تبادلہ خیال سے بہت کچھ سیکھ کر بھی جائے گی۔ یہ مباحث بھی اظہاریوں میں آ کر اخبارات وجرائد کو بھیجے جا سکتے ہیں جو انہیں خوشی خوشی اور پابندی کے ساتھ عام کر کے رہیں گے۔

یہ کوئی تصوراتی Idealistic گفتگو نہیں۔ ہمارے حالات ومعاملات اور وسائل ومسائل کے پیش نظر ایک ممکن العمل تجویز ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر اس پر پچاس فیصد حد تک عمل ہونے لگا تو ہماری صوبائی اسمبلیوں اور پارلیمان اور خود حکومتوں کے لئے کتنا فکری مواد پیدا ہونے لگے گا۔ وہ بھی سوچتے ہیں مگر یہ تو طے ہے کہ بڑے پیمانے پر قومی مسائل کی تفصیلات اور حل سے ناآشنا بھی ہیں اور اپنے طبقاتی مفادات کا شکار بھی..... جبھی ہم برسوں کوئی قابل ذکر ترقی نہیں کر پاتے۔ اگر ان تک مجوزہ قومی سطح پر اذکار حقائق اور تبادلہ خیال کے اختصاریے بھی پہنچنے لگیں تو خود ان کی فکر میں تیزی اور زرخیزی آ سکتی ہے۔ سچ کہ طبقاتی تفریق کے طرفدار از خود کسی قربانی کی پہل نہیں کیا کرتے۔ کوئی ان سے کہے کہ مجھے روٹی نہیں ملتی تو وہ کہتے ہیں کہ پھر تم کیک کھاؤ''۔

(ملکہ فرانس نے دور انقلاب میں یہی کہا تھا)۔

امید ہے کہ آئندہ ان تشریحات میں باغبانی کو بھی یاد رکھا جائے گا۔ آگے لکھتے ہیں:

''جن معاشروں میں انقلاب بہت مشکل ہو جائے جیسا کہ ہمارے ہاں نظر آتا ہے وہاں بڑے پیمانے پر حقائق کی تصویر کشی اور تبادلہ خیال بھی ایک بہتر (خواہ تدریجی) مستقبل کے ذریعے بن سکتے ہیں۔ ممکن ہے انقلاب یا تدریجی تبدیلی کے علاوہ کوئی اور ترکیب بھی ہو وہ فی الحال مجھے معلوم نہیں اور میں اسے جان کر بہت خوش ہوں گا۔''

ایک ترکیب باغبان ایسوسی ایشن کے زیر عمل ہے۔ ہمارا ماٹو ہے۔

''قرآن فہمی اور باغبانی'' امید ہے محترم جمیل الدین عالی صاحب اور فیوچر سوسائٹیاں ہمارے ساتھ مل کر قدم بڑھائیں گی۔ ہم نے تجویز کیا ہے کہ 2006ء کو باغبانی کا سال قرار دیا جائے۔

ملک حنیف وجدانی، صدر باغبان ایسوسی ایشن، سنبل سیداں، نیومری۔

The Basic Human Rights in the Light of The Qura'n

By

Ghulam Ahmad Parwez

English Rendering by A. Rashid Samnakay

==========

Purely on the basis that humankind belongs to the species of Human being, it has certain basic rights, according to the Qura'n. These rights are not in any way dependent upon an understanding or promise nor are they a reward for righteous deeds. Every Human Being is entitled to these with no conditions attached; reward, discrimination on the basis of religion, sect, community, language, colour of skin, race and citizenship. Let us see what these rights are which all Human Beings can demand in a Qura'nic social system.

1. Dignity of Humankind

Every human child, at birth, has the right of dignity. '*WE have created all humankind as worthy of dignity' (*17-70). Hence, differences between humankind of birth (status, genealogy, race, family etc), wealth, trade and profession are against these basic birth rights. In short, gradation of for any reason is an abrogation of Human Rights. "Dignity of humankind" without any conditions attached is the first and basic law of the Qura'n.

2. Gender Equality

According to the Qur'an, gender difference is neither the means of lowering nor raising of status. That is, neither the male on the basis of being male is better nor is the female on the basis of being female worst off. The genesis of life is from the 'one self (4-1)'. Qura'n says "every human child, weather boy or a girl has a part in it of male and female'' (49-13).

Therefore the male is neither a special being nor is the female a different specie. Both genders are of one being and are partners in the one status as human being. There is no aspect which has its door open for one and closed for the other. Biologically the difference that exists between man and woman is from natural inheritance. On human level there is no difference. On this level the field of action is the same for both and the reaction in the law of nature is the same (3-194). 'None of you will have your actions wasted whether you are a male or female'---What is the

meaning of male and female (*thafis*)……..? 'you are part of each other'---'You share equally in all aspects of life'. 'You are part of the same group of people'. Have a look at verses 33-35 and 9-71. How does the Qura'n make man and woman stand shoulder to shoulder in matters of lie.

Gender Equality is the basic right of humanity and cannot be usurped in any way. The Qura'nic social system is responsible for maintaining that equality.

3. The Standard of Deeds as Higher Status.

Following the issue of Dignity, the varying status of Humankind comes to the fore. The rule for it is as follows:

46-19 The status and position of every body is dependent upon their actions. That is the dignity of humankind on the basis of human being will be followed by taking into account the personal character and actions of the individual, and the society as a whole will establish their status and position accordingly. The person of higher capabilities will have the right to higher position in society (49-13). From the highest to the lowest all positions will be open to every body, who according to their capabilities will be able to claim for themselves. This right of status cannot be usurped by any body nor will any other standard be adopted for it.

4. Right of Freedom

You must have heard this slogan many a times " Freedom is every body's birth right" yet its true meaning has seldom been obvious. The place from whence you might have heard this slogan proclaimed, would be the same place from where rules are proclaimed putting all sorts of restrictions on rights of the people. So, one is at a loss to understand that if Freedom is a basic right then why are these restrictions imposed. The answer given is that these restrictions are imposed according to the Law and as such these do not restrict humankind's freedom; and if these laws were not there then nothing would be safe. ---hence for freedom these laws are imperative.

It is true that for the safety of individuals these restrictions are necessary, but it is also obvious that those given the authority to enact these laws perpetrate transgressions, behind the veil of authority that assertion of lawlessness is of no value. The lawlessness (anarchy) is an open revolt but their transgressions take place behind legal curtains. These people in authority first go through the ritual of law-making and then this knife 'blown upon with *Bismillah* from Shah Madar' is used to cut the throat of whoever, thus making the slaughter as *halal.* (i) This is a very important question which has not been answered yet, as to how can the preservation of Right and the necessity of making Laws be reconciled that both remain intact. The solution is given by the Qura'n. It first explained in 3-78/79 'No human being, even though Allah may have given him/her a code of laws or the power to enforce it or even prophethood- has the right to say to others: "you should obey me rather than

God" Qura'n has established the constitution of human right at such a high level that humankind could not even envisage. (ii) This is the reality of Human Rights. Now look at Law making. In the same verse by saying *min dunillaah* it explained that though it is necessary to enact laws they cannot be man-made laws. Only God has that right. Now the question arises as to how are these divine laws to be enacted? Will it be theocracy which in God's name the clergy will do as it pleases? Qura'n says 'NO', theocracy is the worst example of transgression. That is why Qura'n has juxta positioned Haman who was the representative of the clergy, with Pharaoh as an equal criminal. With regard to restriction imposed by law it says in 3-78,79 'no body has the right to tamper with these restrictions or impose others'. This is the practical meaning of *laailaahaa illallaah* that none has the power and authority to subjugate (let alone enslave) any other person. Now it raises the question as to how to practically implement these limits and restrictions given in the Book of God. It is clearly explained that this right is not given to any particular group or community but that it is the collective responsibility of all the individuals of the society and these matters will be "addressed in consultation" (42-38). These rights of consultation are also included in the list. The practical machinery for consultation will be constructed according to the conditions then prevailing.

So the Qura'n has given the laws which must be followed or has established those limits within which the community will consult to change them as required. No one has the right to transgress these limits or to implement others instead, because this will equate to means of usurping the Human freedom and no body can be given that permission. Qura'n equates this to Shirk. Sura Shuaraa 42-41says 'have these people got other partners who enact such rules for which they have no permission from God?' Thus the Qura'n gives no permission to enact such laws for the society.

This is the method by which the Qura'n prevents assault on any Human Rights so that lawlessness does not spread in the society. This collection of distributed right is the unique quality of the Quran.

5. <u>Rights of Labour</u>

Qura'ns pronouncement is that 'every one will get the full reward for their work' (39-70).

No body will usurp the rewards of his/her effort, nor reduce its return. In this respect it said at other place 'except those who are incapacitated to work (which will be discussed later) no body will gain without endeavour'. That is to say that in such a society parasites who sponge off others and live a life of comfort and luxury will have no place. It is therefore obvious that in such a society where ones endeavours will not be exploited, will obtain their rights of just reward. Under this rule the roots of capitalism's are cut off. Its very existence depends upon the exploitation of labour.

Remember that those who, in spite of the capacity to work, sponge off others labour, are in fact beggars however rich they may be.

6. Justice and Fairness

This is what is meant by "Justice"- That every body receives a fair share. According to the Qura'n Justice is a very composite expression in which all rights are preserved. Legal right is the same thing in that its purpose is to restore through the courts the rights of a person whose share has been usurped. On this issue the Qura'n is so careful as to warn: "watch out that in the matter of justice you do not differentiate between a friend and a foe' and 'lest it may happen that as a result of an enemy-nation's behaviour towards you, it may induce you to injustice. You should always treat them with justice, for justice is not a tit-for tat issue. On the basis of humanity it is their right and your obligation" (5-8).

Legal justice means that quarrels and disputes are resolved within the framework of the limits of God's laws. Since Qura'n has not given the power to rule to mankind it means that it has not given the right to enact laws to any person or a group either. Justice is the name given to the establishment of God's laws. If the State's law happens to be against that of Qura'n, every citizen has the right to demand change in it and the State is obliged to change it.

But Qura'n just does not stop at Justice. It goes beyond (as has been said before). Justice means that whatever is due to people, is given. But what if that is not enough for their necessities? Qura'n says that in that case the society makes up for the shortfall in order to maintain the balance (*ehsaan*) of the social system (16-90). This ehsaan is also included in the basic rights. The world encourages 'charity' in such cases. But charity tramples humanity and it is obvious how it destroys self respect of the receiver of charity! That is why Qura'n does not refer to ehsaan as charity but says that to demand the topping up of this shortfall is a Right. (70-24) Those who's endeavours are not enough or those who are incapable to provide for themselves have a share in the wealth of those who have more than their requirement. This right is not under cover or secret but is transparent to the Qura'nic social system. To make up for the shortfall of people as a basic right will not be found in any other document except the Quran.

7. The Right of Sustenance

The life source of humanity (indeed of all living things) is the provision of sustenance. The world has decreed that every individual fulfils his responsibility to provide for all their needs and that of their children. But Qura'n in this respect differs from the world. It says ' there is no living being in this world, the responsibility of whose providing for its provision is not on Allah11-6'.

It has to be understood that those responsibilities that Allah has taken upon Himself are to be fulfilled by the State that runs on Qura'nic system. Hence it is the responsibility of any State that runs on Qura'nic system, to ensure that it establishes a system wherein no living creature lacks the necessities of life and declares to all its citizens 'we are responsible to provide for your and your progeny's basic necessities too 6-152'. The provision of basic necessities of life is a right of every human being and he can demand it from a system based on Qura'nic principles. This right is not written in any other Charter in the world.

The clarification of this can be found in my book "Nizam-e-Rabubiyat".

With respect to the provision for the progeny, it also includes the provision of resources for their eduction and training. 'Do not murder your children due to the lack of resources 6-152'. Here the word 'murder' does not only mean to kill. It also means to destroy by denying education and training (soul destroying). Hence it is the obligation of the Qura'nic system to provide for the best education and training of children. As a result every child can demand best education and training as a right in a Quranic system of State and no body can deny them this right.

8. Sanctity of Life.

But before the provision of necessities of life, the protection of life becomes an issue. The Qura'n has clearly expounded 'God has declared the sanctity of life, hence no body can be given the permission to take life, except when Right demands it (6-152)'. Qura'n explains in another context what this demand is. If one murders another unjustly then the former can be sentenced to death in response, or if one causes disruption in the justice and social system and cannot be refrained from it after repeated attempts, a death sentence can be given. Outside these conditions if one is to take life for no reason, it would be construed as if the whole of humanity is murdered. On the other hand if one saves one life it is equated to the saving of the whole of humanity. (5-32). Have you noted that under which special conditions has Qura'n allowed taking of a life (that is taking of a life legally)? That too is for the purposes of universal protection of life. That is what it calls *bil haq.*

9. Sanctity of Wealth

Along with the sanctity of life, the sanctity of wealth which remains for the individuals use, is also included in the basic rights. No body is allowed to usurp what others have for their legitimate use. For it says that you should not usurp each others wealth (4-29). Wealth is a compound word and includes possessions of every kind and its protection is a basic right.

One aspect of this comes to fore here. If ones place is burgled, the universal legal justice punishes the thief, but the one who's wealth was stolen, has no redress to

his/her loss. If the theft was not due to their negligence or lack of care, then they have a right to redress the loss. This rule applies within limits to other losses too.

10. Protection of Residence

Following the protection of life and wealth the Qura'n also provides the right to safety of residence. The allegations Qura'n lays at the feet of Jews is this 'You are the people who unjustly murder and drive out people from their homes 2-85'. Hence to provide roof over the head is also an obligation of the State and to deny it is an abrogation of the individual's basic right.

11. Sanctity of Honour

Human honour is invaluable commodity. This thing of the highest standard is not found in the animal kingdom and is only a human speciality. Sexual urge is common among both animals and human, but the sense of honour is only found in the domain of humanity. Hence Qura'n gives the protection of honour a permanent value of Right. Therefore it has ordained the flouting of honour as a major crime and has prescribed a heavy penalty. Adulterer, 'be it male or female, punish them with hundred lashes.24-2'.

Not only in adultery but to cast unproven aspersions on the honour of a respectable woman is to be punished with eighty lashes 24-4. It is so because this is also an assault on her honour.

To accost and tease respectable women, to pass derogatory and incite-full comments upon them is even greater crime. In this respect it says that such people should be exiled. Such people should be stripped of their citizenship. If they do not recant, they should be taken in custody and on proof of their guilt executed, 33-60.This is that divine rule about which it says 'this is the law that was given to the previous nations and it is of such permanent value that there can be no change made to it.22-61. The maintenance of all these laws is the State's responsibility.

12. Right of Choice in Marriage

With respect to married couples, Qura'n has ordained that the choice of a spouse is a basic human right. It addressed men 'you marry women according to your choice 4-3' and on the other hand has protected the right of choice of women in addressing men 'you can not be their master by force 4-19'. Marriage is a contract for which the agreement of the two parties is the basic condition.

In this context it must be emphasised that after the 'contract of marriage' the responsibilities of husband and wife according to Qura'n are equal in all spheres of life. There is only one exception to the rule. In the situation of divorce or widow-hood, the woman is not allowed to remarry during the period known as *iddat.* There is no such iddat for man and its rationale is obvious. The period establishes if the

woman is pregnant. This rule is for the protection of the child's right, in order to establish the biological father of the child. In Surah Baqara it said 'the women have similar rights commensurate with their responsibilities. There is only one aspect where the men have an advantage in that they do not have to wait for the passing of the iddat 2-228'.

The protection of these rights is a State's responsibility.

13. Aesthetic Right

The Qura'n respects an individual's aesthetic taste and does not allow any body to deprive the person of this right. It emphasises 'who is it that can deny the aesthetic resources that HE has provided for HIS servants and make unlawful for them to enjoy it 7-32.' It is every body's basic right to enjoy them while staying within the divine limits. No body can deny them of the right. As a rule it must be understood that what God has not forbidden, no one can declare it as forbidden. This is equal to usurping the basic rights which nobody has the authority. It must also be understood that Qura'n does not restrict the manner of food consumption and people's life style. Instead it has given the right of choice to all according to ones taste. It says that you are free to eat and drink at any body's house including that of your relatives and friends, wether you eat separately or together 24-61. Similarly it does not place any restrictions on style and type of dress and encourages every body's sense of aesthetics. It also says that in addition to covering ones modesty, the dress is also for decoration 7-26. Gold ornaments, silver and glass utensils, soft and smooth silk clothes, and even high class furniture (76-13to 15 and 18-31) and similar objects are manifestation of *jannah.* Although it is necessary to realise that the whole society is in a position to afford such a standard. It is never said that this heavenly life is a prerogative of only a select group and others will go without. The heavenly life that an individual can afford must be available to all the members of the society.

14. Religious Freedom

The Qura'n gives full freedom of religion. It maintains that the *Iman* (belief) is the name of accepting the truth with the application of higher intellect, contemplation and vision. 'Tell them that Truth has come in Qura'n from your Sustainer, you should contemplate on it and then whoever wishes to accept it, do so and who ever wishes to reject it, do so18-29.' It has also emphasised that the difference between the other creations of universe and mankind is that every thing in the universe is obliged to obey the rule that has been set for it, but humankind is created to exercise a choice. It has been shown the path and left alone to it own choice to either follow the path or digress from it. If it follows the shown path it will lead a pleasant life; if not, it will be at a loss. If it was God's wish to force it to follow a certain path it would have been created similar to other objects in the universe but it is not so. It has been created with power of exercising choice. It would be against the

divine will that humankind should be compelled to follow a certain path. Qura'n has addressed humankind 'if it was in your Lord's programme that humankind was to be compelled to follow the path of *iman*, then there was nothing to stop HIM, but HE has not created humankind so; it has been given a choice in this matter, so would you compel it to believe? That would be against Divine will. Your duty is only to pass on the message, you are not expected to do more10-99'. The right and wrong has been made evident by the Qura'n. 'After this there is no compulsion in the matter of Deen2-256'.

The reality is that Islam is not a Religion (mazhab). This word is not in the Qura'n. So it does not accept other religions of the world as its worthy opponent. It is a Code for life or a system of government. It cannot allow that those of other religions should set up a different system of government within its borders. This would be equivalent to setting up a State-with-in-a-State which is not allowed anywhere else either. But it does not oppose that people who live within its State boundaries chose their religion. It gives them the freedom to do so. It takes upon itself the responsibility of the security of their houses of worship in the same manner as it does for the mosques. Qura'n establishes the reason for an Islamic State thus-'if God were not to have controlled through humankind the rebellious elements in society then certainly the monk's monasteries, Christian churches, other houses of worship and mosques, where God's name is taken in abundance, would be demolished 22-40'. Hence the security of all houses of worship rests with the States operating on Qura'nic system of government where all non Muslims can demand security as their basic right.

Not only that but it has stressed upon the community of believers that –you should not swear at their Gods lest the non-believers, in their ignorance swear at Allah.

As you would be offended, they too are offended by your disrespect to their idols. The fact is that every body loves and respects their own object of worship 6-109. You should convey to them the truth. When, with vision and understanding they are able to differentiate between right and wrong they will discard their false Gods and adopt the right path to lead their life. You will not be able to compel them to do so.

Hence the Qura'an not only gives humankind the freedom but gives assurance that their religion is protected from abuse.

At this stage I apologise for digressing a bit. Although God has given total freedom to humankind in respect of religion, the Muslim sharia leadership allows non-Muslims to choose and change their religion but a Muslim has no right to do so. If a Muslim converts he/she is put to death. The death penalty is applicable not only in respect of conversion but if a Muslim expresses opinion different to theirs and they declare the person *murtad* (blasphemer), the death penalty applies there too.

It should be realised that one has the basic right to either adopt the *Deen* and live within an Islamic system or exercise the choice to live outside it, but it is not allowed that a person would accept the system superficially and then select those codes that suit him/her and reject the others. This sort of freedom is not available in any system.

All rule of the State have to be obeyed. But if the person converts to other religion and still wishes to live in the Islamic State then there are choices that he/she stays there as a non-Muslim Dhimmi or goes some where else to live.

After this digression I come back to the main theme. According to Qura'n the next right is that of the right to speak the truth.

15. The Right to Speak the Truth

Qura'n has not only given us the Right to speak the Truth, but has ordained upon us to practice it. There is no choice given in it. It has ordained that whereever there is the necessity, speak out truthfully. Let us see how far Qura'n goes in this respect. 'oh you the people of belief, it is obligatory upon you to maintain justice in the world'. It is imperative in order to maintain justice that truth should be told without fear or favour'. 'When called upon to give witness you should not consider as to which party or group you are speaking against, you should think that you are a witness to God and tell the truth even if it is against your own self' (see how Qura'n elevates the position of humankind). 'even if it goes against your parents or relatives', 'whether rich or poor', for 'Allah's right is bigger than theirs'. 'Remember that your vested interests, the relationship of relatives and friends and the fear of reprisal from the rich and influential, can stand in the way'. 'But you should not consider these issues and stand firm in your resolve'. 'Nor should you speak with forked tongue nor should you avoid the truth, you may be able to fool people but you can't fool Allah, HE knows all'4-135. Speak the truth openly.

Having given the above edict, it warns the society that it should implement such a system that the witness suffers no reprisals on giving witness 2-282.

16. Freedom of Expression

To express ones opinion also fall in this area. One of the differences between animal kingdom and humankind, according to Qura'n is that the former do not have the capacity to express its consciences. humankind has been given this capability. God has created humankind and has given it the capacity to express itself 55-4, and at other place it says that HE has given humankind the capacity to express itself 'with the pen 96-4'.

Humankind has the right to express its opinion with the help of a tongue (language) and with pen as well.

It must be understood that expression of opinion or the use of any other God-given faculty in contravention of HIS laws is a crime and worthy of punishment. It is different thing to restrict or curtail these God given capacities. The wrong use of these capacities can be rendered as crime but the right to use them cannot be usurped. To do so would be akin to turn humankind into an animal.

17. The right of protection of privacy

Qura'n prevents us from unnecessarily scrutinising individual's privacy 49-12. It means that it gives the individual the assurance that their privacy will not be encroached upon.(In the matter of crime investigation it becomes a different issue). The protection of the content of letters and correspondence falls in this category. It thus gives the right of privacy to an individual when it says 'except in your own, you should not enter into others houses without the resident's permission 24-27.

18. Protection against Slander

Qura'an provides for protection against slander. It says 'Allah does not like that a persons weakness be propagated maliciously 4-148'. If correction is intended then it should be under taken quietly, then it says 'a group or party should not belittle another 49-11. No derogatory names be given. One must not be teased, just on the basis of rumour 49-12. This explains why one should be presumed innocent till proved guilty and no talk behind the back be indulged into 24-12 and 24-16. Back-biting is strictly forbidden in Qura'n 49-12. With these given warnings, Qura'n protects individuals privacy.

19. Assurance of Peace

Qura'n steps further after giving all the above rights. 'These people will have no fear and stress 2-38'.Fear is an anxiety caused by the external dangers. Hence this society will be protected from external dangers by the State. Stress is the name given to the trauma caused by these anxieties. Thus in a system where the State has taken the responsibility of protecting the people from external dangers, it is also its responsibility to remove the causes of anxieties. The protection from fear and stress is such a composite statement that it conjures up the concept of total bliss. In this protection also lies the idea 'no body who can a carry a burden will carry the burden of another 6-165'. It will not happen that one will take the action but some one else will reap the reward. That the responsibility should be of some one but some one else would fulfil the responsibility. Some one should commit a crime but some one else would suffer the consequences. This is the security with which all will get true contentment. The acquisition of it is the basic right of every individual.

These are the basic right that Quran accepts as the Human Rights, and their sanctity is given by the Quranic System.

==========

LAW OF THE JUNGLE (Part II)

By

Aboo Bakr Rana

==========

The intelligentsia, scholars and thinkers have, indeed always indirectly played an important role in leading the people, of any culture, towards a certain direction. Whenever the *liet motiv* of the scholars' thoughts was harmonious, we observe the change in the life of that culture gained acceleration and momentum, irrespective of the fact, whether the direction of change was towards constructive or destructive purposes. It is the cohesiveness in the thoughts of intellectuals that has always remained the cause of bonding the social structure and uniting the community. For example after the downfall of the Mughal Empire, we notice a complete depression in the intellectuals of Indo-Pak subcontinent. Their literature, music, arts and poetry was nothing but melancholic. As soon as the spark of awareness was lit, the same Muslims became dynamic in their thoughts and actions. The role of *rationality* has perpetually remained the nucleus of change. When the thoughts of these rational minds synchronize with the laws of nature, the direction of change becomes progressive and constructive. Otherwise it has been destructive and regressive. Or put in other words, if reason it is, that plays an important role in changing the infrastructure of any community, then we must make sure, whose logic or reason we are implementing. Intrinsically there are only two sources of reason. It is either Human reason or Divine reason, which has always been at work. As far as Divine reason is concerned, the Holy Quran vividly reiterates in the Chapter of Al-An'aam:

> *The system of God, maintaining within itself all truths, with balance and justice is now complete. Its aa'ya (sentences) can never be changed, because this system belongs to Him, who is all ears and possesses all the knowledge. If the validity of this system is questioned, that it does not conform to the practices on which the majorities live their lives, it is irrelevant. The fact is, the general attitude of the majorities in this world is that they only guess and follow conjecture.* (Mufhoom ul Quran, by Allama Parwez, 6/116-17).

Divine reason can only be incorporated in practical living, when we cleanse the rust of bigotry and prejudice from our minds, which is embedded due to centuries old traditions of our history. Again, we must admit, it is not easy for humanity at large and Muslims in particular, who are sincerely in search of Truth, to uncover the realities that remain dormant in the words of the Quran; for most of us are influenced and subjected to our personal beliefs which are deeply rooted in our sub or unconscious minds. The preconceived notions that we bring with us from the day we

are born, need a collective legal system in order to be removed from our thoughts. In simple words, it means indeed, doing away with all those traditions and rituals which are not producing productive and fruitful results; the practical world needs collective efforts of each and every individual who belongs to the Islamic order. Another important fault with Human reason is that it usually overlooks, to remind the milieu, the fact that hatred must not be directed towards any group of individual. We must hate thoughts and ideas that incite us towards evil. None of us has ever seen God or has ever had a telephone call from Satan. It is their ideas, good or bad, floating in the atmosphere, which govern and control our lives. It is our choice of these ideas in our lives that brings us peace or take us into hell. God clearly declares in the Quran that everyone shall be rewarded, whether they believe in Him or not, for their good deed goes unpunished. The good are always appreciative and thankful. Whereas the Evil ones think that grateful are dead people. God wants us to think, understand and then choose our ways in life. Satan wants us to compete in this world, regardless whither the path leads. The two paths of good and evil are there for us to follow. This choice is ours, which path we desire to follow; except, we have no control over the consequences, on the path we have chosen. The consequences of natural laws are beyond us. Fresh air, wherever we may encounter, shall always be healthy, and polluted air will always remain injurious. This is the law of nature that we cannot change and over which we have no control.

In all the monotheistic systems, the values of Divine reason have been consistent and progressive. In all these systems human thought is directed towards an after life, yet we must know, in order to justify our rational process, why the Omnipotent, felt the need to mention after life, when He should be explaining the enigmas of this world only, in all His revelations. Divine reason guides, that our present day problems, indeed, do have a link with after life. In the same way, as a developing human embryo which is a part of its mother has a future link with this worldly life. We are adamant, our problems for all intents and purposes, belong to here and now and not in the hereafter. And this is precisely, where the discrepancy of Human reason is rooted. One can confidently say, it is at this point that Human and Divine reasons begin to part ways from each other, in our daily living.

Human reason says that we will only cross the bridges when we come to them. Whereas Divine revelations guide us, certainly it is true, we can only cross the bridge when we come to it—and it makes us think, “What do we have in our possession, to take with us for the other side of the bridge?” Are we prepared to go to the other side? Warning us, that it is going to be an all together different story. Human mind again reasons that this is not our problem; we did not create this world or the other world. This problem is of the Being, whosoever created us. Divine reason reveals, indeed, it is not human problem and that is why We are guiding, as to where human mind should and must look for the material, if it wants to avoid the wrath of

after life. And it is at this decisive moment in time, that intellectuals mostly falter and make a jungle out of this world. The interpretations of Divine reason (or revelations) are so varied, perhaps because of its misunderstood abstract nature, but more so because of our personal interests (including myself) that are involved in it, that do not allow us to apply Divine reason impartially; it is making it incomprehensible to human mind, and due to which humanity has taken the easy way, by dividing itself into different colours, races and factions. Without realizing, it is these very divisions that are the main cause, among us, of all frictions, wars and disasters. We forget in our daily grinding, for those of us who believe in the omnipotence of the King of this Universe, that we only belong to Him and no other being. It is He who has created us and it is He who knows how Humanity can have a smooth sailing on the turbulent seas of this life. For those of us who do not believe this universe has a Creator, this discussion shall not be valid.

Human mind can and does have the capability to solve these mysteries of life, by virtue of its reason alone. Being a creature, as mentioned above, more prone to preconceived notions, it takes thousands of years, and sometimes many thousands to resolve these issues. The trial and error method of human mind is extremely painful and consumes so much time, due to which the mind, while attempting to solve the mysteries of life on its own, has mostly ended in illusions. Sometimes the screams of despair and isolation become so loud and yet so subtle, if we care to listen with open hearts. For example, any one who has ever had a brush with wishful thinking can feel the pain and anguish of the poet, in the following words:

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

(Neither God was found, nor any peace begotten in this restless world.
The whole life has been torn apart between these two worlds.)

To avoid the dread of the unknown, humankind either escapes and becomes a material cog in the scientific industry or just stops thinking and prefers to remain an animal by creating a god that is nothing else but a figment of its own imagination. The natural human being which the real God wants us to become, escapes our mind. And by natural Human, it must not be concluded that we let ourselves go and start living a bohemian life of the jungle. It is indeed impossible, gentlemen, to set a standard and define what a Natural Human Being means, ***through human reason alone.*** Human reason did not make the human being. Human reason is as varied as the different individual experiences we go through. Natural Human Beings always live their lives according to the dictates of Divine reason. Natural human beings can only be born and brought up in a natural system. From this it must not be construed

that modern research and technology must be done away with and eschewed. Science is absolutely essential and ought to be used within the parameters defined by Divine reason.

For those of us who say that "faith is blind," there is no wonder the reasons they put forth are also blind to peaceful living. Furthermore, I would like to ask, and which *computer company* put this thing called "brain" in the human body? After all gentlemen, isn't human reasoning also given to us, as it is given to all other living beings on a smaller scale, by the same Creator? And I will be ever so grateful to them, who can show me in any religious scriptures, leave alone the Islamic system, wherein it is commanded not to use our minds!! Or, this brain is a useless thing of nature and must not be used!! It is the jungle people, who invent different techniques to gag their prey, in order to hunt for their survival. Fear of the unknown does not let them venture into new realms of thought. We seem to rather prefer, to cling to age old conventions, rituals or traditions, even though these rituals may not be making any sense at all in our practical lives. Again it must not be taken to mean all rituals and traditions are bad. It only means those rituals that have lost their efficacy in our practical lives, or to be more pertinent, those traditions that do not coincide with the Divine words of Quran; Quran being the only complete book which contains within its words, the complete codes of our lives. (Al-An'aam, 6/116).

In the fight against Evil, we human beings are constantly forgetting or misunderstanding the instructions that have been revealed to us by God. Hence creating a jungle for ourselves, in which there are no paths or signposts, on which to travel and reach our destination. Or, the paths of religion and its rituals are in so dilapidated a condition that we keep getting off our tracks. Consequently, when we lose our ways in life, we ruthlessly run over or walk over each other. In jungle life there are no scruples for survival. The only scruple is to tear apart anything that stands in the way of survival. For that purpose we do not even refrain from misusing the name of God, to achieve our ends. We ought to obviously expect that state of affairs, since there are no rules to the game. When we speak of destroying everything for our survival, then we human beings even destroy our own selves. When we are young and full of spirits and enthusiasm, we are asked, "Who are you?" Then we begin to struggle and define who we are, and we are put the second question, "Why are you?" That is when our fights start in life. But for those of us who still remain tolerant and continue doing what is within our capacity, in looking after our families, helping the kids grow up, being peaceful citizens, etcetera, the last nail in our coffin is hammered in our old age and we are painfully sent to the grave with the final question, **"What are you?"** If anyone is desirous of an immediate panacea to these pessimistic statements of negating others, being candid, I have no answer. We have done it with Sir Syed Ahmed, Dr. Allama Iqbal and Jinnah, though we do celebrate

their anniversaries and pay lip service to them. But how many of us pay any heed to what they stood for, or try to understand, why they sacrificed their lives.

Even the famous socialist Carl Marx after his life long research, came to the conclusion that in order to establish peace in this world, we must have a system, in which every person works according to his/her capacity and is provided according to their needs. In simple terms, "From each according to his capacity, to each according to his needs." But how to implement such an ideology in this world, for that he needed to give us an incentive, as to why a person, should give all of its surplus wealth to others. And that incentive, he admitted, he was unable to find in all his lifetime of research. What attraction is there for a person, who through his/her intelligence or sheer force of power has accumulated material wealth for the comforts of their own life, to give or distribute it for the needy? Each individual's brain is made to serve the interests of that individual. *"To each his own"* is the slogan in this material world. And no intellectual or thinker ever has, or ever will be able to provide any reason, as to why a person must give to another, in this world. The only condition when we give to others is, when our own selfish interest is involved. Otherwise the world considers them mentally deranged who are philanthropic for nothing. It is at this moment in human history, Divine reasoning has always intervened in human affairs and gave them guidance as to why they must share their joys and sorrows with others. Time and again we human beings relegate the power of true reason, and 'brute force' becomes the call of the day, which leads us into barbarism, thrill and glamour. Besides bringing the Indo-Pak Muslims out of their depression, it was their attitude towards life for which Sir Syed Ahmed, who first of all, struggled all his life. He was diverting their thoughts towards nature, for which he was labeled as 'Natury' by his opponents, which in his own community were the *mullahs* or the priest craft institution. It is this difference between Human reason and Divine reason that Dr. Allama Iqbal also attempted to clarify all his life. All his literature, one can easily say, is an interpretation of the meanings of these two sources of reason, but to give you just one sentence would, I suppose, suffice. When he says:

ع ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

(The minaret call of the Mullah [priest] and that of a Man of one God are poles apart.)

These words again are now being misused deliberately, by the priest craft community so many times, in the mosques and in their speeches, that we are losing the essence of their meanings with the passing of time. Therefore now,

ع فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

(The meat of Ghazali is all lost and what remains are only his bones for us)

The other discovery of Dr. Allama Iqbal, which the priest craft institution is misusing, is that politics cannot be separated from the system of Islam. Especially in our modern age, when the West has apparently relegated the Church from their States and are proving their advancement to the rest of the world. The learned Allama says:

ع جدا ہو دیں سے سیاست تو رہ جاتی ہے چنگیزی

(When we separate the system of Islam from politics,
its outcome is nothing but barbarism)

It is due to this statement, in the South Asian subcontinent, that our *mullahs* or preachers of Islamic religion are sneaking themselves into politics. The public again is being misguided and hoodwinked, by these preachers who are mixing the word *Deen (the collective system of Islam)* with Religion. The learned Allama is not talking of joining religion with politics (these were already one and the same; those of us who are well versed in today's politics, know that we are already living in the whirlpool of Machiavellians). In order to maintain a peaceful environment, he says that it is *Deen (the Islamic system as prescribed in the Quran)* and not religion, which must be included in politics.

The simple folks, who hardly have any time to make their two ends meet in their daily grinds, let alone having time to think profoundly on matters of Islam, follow whatever is thrown at them in the name of Islam. Needless to say, this state of affairs was haven for the priest craft institution, when Pakistan was in the making. In the early years, after the creation of Pakistan, these preachers were bamboozled, as to how did Pakistan happen to come on the map of this world and therefore did not know what to say and how to confront the masses. Even those who were against the concept of Pakistan had the audacity to enter into the territory of this new nation. Slowly the priest craft began to slink the germs of religious terminology, into the minds of the people again, by misusing the words of Dr. Iqbal, and are now gradually enfeebling the nation with their religious abracadabra. Leading the nation again, towards the jungle and barbaric life that humanity was leading before the advent of Islam.

According to my understanding of Allama Iqbal's message, 'Religion' means the daily worship in the form of certain rituals, whereas 'Deen' is merging the Muslims collectively into the natural system, in which rituals are just one small part of that system. The natural system, for which among many others, Sir Syed Ahmed, Dr. Iqbal, Allama G.A. Parwez and the first Governor General of Pakistan, Jinnah crusaded, can only be found in the guidance of Quran, given to us by the Creator of this Universe, in which no human being has the right to govern another human, directly or indirectly. This rule applies even to the Messengers of Almighty. Religion, Dr. Iqbal mentions, is an alien plant in the soil of Islam. These preachers are not

mixing *Deen* with politics, rather they are mixing conspired religious traditions with Islam; instead of eliminating barbaric *Changezism,* we are very much inviting it into our lives. Why blame the western community, if they are calling this state Pak-Satan instead of Pakistan. Why not blame our own selves and be bold enough to shoulder the responsibility of our own ignorance, in matters concerning Islam? Just ask these *Mullahs* of different sects, to give us a unanimous definition of a 'Muslim,' and I shall devote my whole life to follow in their footsteps. Each sect decrees the other Islamic sect as a pagan or *kafir,* just to gain power for itself, demonstrating zero tolerance for each other in practical living. Yet they dream of establishing an Islamic empire. For the kind information of the Mullahs, Islam was established by extreme tolerance and forgiveness.

God is very clear on this issue of segregation of Islam into sects. Quran as mentioned before is a complete code of life, and misses nothing that concerns the collective or individual lives of human beings. It addresses this predicament of segregation also, when it says:

> *And be not among those who segregate themselves into religious sects. And each party, sect or faction professes itself to be on the correct path. Schism is parallel to (Shirq) idol worship. (Al-Room 30/32).*
>
> *More references on this topic can be found in chapters, 3/104: 6/160: 23/53: 42/13.*

To top it all, the masses are mesmerized by the flaming speeches of different Mullahs. Besides this, just to remain stubborn on their opinions, these religious people justify themselves by deceiving the simple minds with their jugglery of words. According to them, these partitions in Islam, they say are not sects or schisms, these are only different schools of thought. There were no schools of thought, gentlemen, during the times of any messenger of God. And to stay stubborn, these sick maniacs, instead of admitting their faults, insist that Muhammad(PBUH) predicted the formation of sects in Hadith. In other ways, the prediction of the Messenger overrules the word of God, that is in the Quran in chapter Al-Room 30/32… … …!

We can only pray, ***"O God! Please give us the courage to admit our defects, we are only puny creatures, we need Your help to even enjoy your blessings. Please God, show us the way to eliminate ignorance from amongst us. We do not want Your wrath, we are desirous of the peace that Thou hast promised. Please give us the knowledge to achieve that peace and unity among us!"***

Those who are teaching in educational institutions refuse to revise the unprecedented ideology and history of Pakistan, as to how it was created without guns or ammunition, on the lines of Quran, as was done before, only by the Messengers of God. No wonder Iqbal said ages ago:

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کے

(My Provider! I am suspicious against the authorities in academics. They are giving, to innocent and nimble minds that have potentialities of soaring to heights, lessons of Machiavellian trash.)

Pakistan was carved on the map, not to be a theocratic state. It was created to implement the permanent principles and values of Quran, as was done during the times of the last Messenger. We have already seen what havoc religion is unleashing in our own lifetime. The Islamic revolution of Iran, to take one example, could not make any headway, since they substituted one form of clerics with another form of clergy, at the cost of thousands of human lives. Yet the political jungle of theocrats remains cold hearted, they refuse to learn any lesson from other nations and turn a cold shoulder to the deteriorating human conditions. Words, gentlemen, are all we have now for a beating heart, at our disposal. And,

ع مردِ ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

(Gentle words are meaningless for a foolhardy.)

****